ناموران اسلام

از

محمد حسین حسان جامعی
ایڈیٹر پیام تعلیم

ناموران اسلام

از

محمد حسین حسّان جامعی
اڈیٹر پیام تعلیم

مکتبہ جامعہ
دہلی - نئی دہلی - لاہور - لکھنؤ - بمبئی

قیمت عہ

ہزار

دلی پرنٹنگ ورکس دہلی

قیمت عہ/ ۱۹۳۹ء ۲۰۰

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	حضرت سعد ابی وقاص	۹	۱۳	طبری	۷۰
۲	خالد بن ولید	۱۴	۱۴	جعفر برمکی	۷۳
۳	محمد بن قاسم	۱۸	۱۵	جاحظ	۷۷
۴	حضرت عمرو بن عبد العزیز	۲۳	۱۶	خلیفہ مامون عباسی	۸۳
۵	طارق بن زیاد	۲۹	۱۷	ابونصر فارابی	۹۰
۶	امام اعظم حضرت ابوحنیفہ	۳۴	۱۸	امام ابوالحسن اشعری	۹۳
۷	امام مالک	۴۰	۱۹	متنبی	۹۸
۸	عبدالرحمٰن الداخل	۴۶	۲۰	امام ابن ہیثم	۱۰۳
۹	امام شافعی	۵۰	۲۱	ابوریحان بیرونی	۱۰۷
۱۰	امام احمد بن حنبل	۵۵	۲۲	ابوبکر زکریا رازی	۱۱۲
۱۱	امام بخاری	۶۱	۲۳	ابن سینا	۱۱۷
۱۲	ابوداؤد ظاہری	۶۷	۲۴	علامہ ابن حزم ظاہری	۱۲۴
			۲۵	نظام الملک طوسی	۱۲۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۲۶	ملک شاہ سلجوقی	۱۳۱
۲۷	جار اللہ زمخشری	
۲۸	امام غزالی	۱۳۶
۲۹	حضرت عبدالقادر جیلانی	۱۴۱
۳۰	ابن رشد	۱۴۴
۳۱	سلطان صلاح الدین ایوبی	۱۴۹
۳۲	خواجہ معین الدین اجمیری	۱۵۳
۳۳	ابن جبیر	۱۵۶
۳۴	امام رازی	۱۵۸
۳۵	ابن اثیر	۱۶۳
۳۶	شیخ ابن عربی اندلسی	۱۶۵
۳۷	شیخ سعدی شیرازی	۱۶۷
۳۸	مولانا رومی	۱۷۲
۳۹	قاضی ابن خلکان	۱۷۸
۴۰	امام ابن تیمیہ	۱۸۰
۴۱	شمس الدین الذہبی	۱۸۶
۴۲	ابن بطوطہ	۱۸۷
۴۳	خواجہ حافظ	۱۹۰
۴۴	علامہ ابن خلدون	۱۹۴
۴۵	سلیمان اعظم	۱۹۸
۴۶	خیر الدین باشا	۲۰۵
۴۷	شیر شاہ سوری	۲۱۱
۴۸	ابو الفضل	۲۱۴
۴۹	حضرت مجدد الف ثانی	۲۱۷
۵۰	حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی	۲۲۳
۵۱	غالب	۲۲۷
۵۲	سید احمد خاں	۲۳۲
۵۳	مولانا حالی	۲۳۹
۵۴	سید جمال الدین افغانی	۲۴۷
۵۵	محمد حسین آزاد	۲۵۳
۵۶	مولانا شبلی نعمانی	۲۵۸
۵۷	حکیم اجمل خاں	۲۶۲
۵۸	مولانا محمد علی	۲۶۹
۵۹	ڈاکٹر اقبال	۲۷۴
۶۰	مصطفیٰ کمال پاشا	۲۸۲

ایک نامور ہندی مسلمان علامہ سیّد سلیمان ندوی کے نام

محمد حسین حسّان

تمہید

کئی سال ہوئے مکتبے نے ناموران اسلام پر بچوں کے لئے ایک مختصر سی کتاب شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ تھوڑا بہت مواد بھی فراہم ہو گیا تھا۔ لیکن پھر دوسری مصروفیتیں حائل ہوئیں اور یہ کام بہت دنوں تک رُکا رہا تاہم جب کبھی موقع مل جاتا تھا اسے مکمل کرنے کی فکر کی جاتی تھی۔ اس طرح آہستہ آہستہ اتنا مسالا اکٹھا ہو گیا کہ اسے کتاب کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں میں بڑے بڑے لوگ بے شمار ہیں۔ ان سب کے حالات لکھے جائیں تو ایسی ایسی بے شمار کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے صرف چند ناموں کا انتخاب کوئی آسان کام نہ تھا۔ بارے برادر محترم سید نذیر نیازی صاحب اور علامہ سید سلیمان ندوی صاحب مدظلہ کی مدد سے یہ مشکل حل ہوئی۔ پہلے مختلف علوم و فنون کی ایک فہرست بنا لی گئی، پھر ہر فن کے دو دو چار چار آدمی منتخب کر لئے گئے۔ سائنس دانوں اور جہازرانو

میں اس وقت مستند حالات صرف دو شخصوں کے مل سکتے تھے، بعض اور نام اور حالات اس وقت ملے جب کتاب چھپ چکی تھی انشاءاللہ آئندہ ایڈیشن میں یہ نام بڑھادیے جائیں گے۔

کتاب کے لئے مسالا زیادہ تر عربی پھر اردو، فارسی کتابوں سے لیا گیا انسائکلوپیڈیا آف اسلام سے بھی بہت کچھ مدد ملی مسودے کے ایک بڑے حصے پر باوجود کم فرصتی کے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے نظر ڈال لی ہے مخدومی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے بھی اسے کہیں کہیں سے بہ نظر اصلاح دیکھا ہے۔ کتاب میں اگر کوئی خوبی پیدا ہوگئی ہے تو وہ ان ہی بزرگوں کے فیض توجہ سے۔

زبان اور پیرایۂ بیان مقدور بھر آسان اور پُر اثر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نہ جانے اس میں مرتب کو کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی ہے، حالات کی ترتیب سنہ وار ہے فن وار فہرست ضمیمہ کے طور پر آخر میں دے دی گئی ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے اپنے اسلاف کے ان کارناموں سے مفید سبق حاصل کریں ان میں زندگی کی روح دوڑے اور قوم و ملک کے لئے کچھ کر جانے کا حوصلہ پیدا ہو۔

محمد حسین حسّان جامعی ندوی
ایڈیٹر "پیام تعلیم"

حضرت سعد ابی وقاص

حضرت سعد ابی وقاص ننہالی رشتے سے ہمارے رسول (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے ماموں ہوتے ہیں۔ ۱۹-۷ برس کی عمر میں مسلمان ہوئے ہمارے رسولؐ نے صحابہ رضؓ کو ہجرت کا حکم دیا تو یہ بھی مدینے چلے گئے۔ یہاں اُنھوں نے مختلف خدمتیں انجام دیں۔ بدر کے معرکے میں غیر معمولی بہادری دکھائی۔ اُحد کی لڑائی میں مسلمانوں کے قدم اُکھڑ چلے مگر یہ آخر تک جمے رہے۔ ان کے علاوہ تمام غزووں میں شریک رہے اور نہایت پامردی اور جوش سے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر سخت بیمار پڑے (آں حضرتؐ کی دعا کے اثر سے اچھے ہوئے) آپؐ نے انھیں یہ خوش خبری سنائی کہ سعد! تم اُس وقت تک نہ مروگے جب تک ایک قوم کو

تم سے نفع اور دوسری کو نقصان نہ پہنچ جائے یہ پیشین گوئی عجمی اور ایرانی فتوحات سے پوری ہوئی۔

شام اور عراق پر مسلمانوں کے حملے حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں شروع ہو چکے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اُن کا انتظام اور بھی بڑے پیمانے پر کیا۔ اُنھوں نے تمام ملک میں جہاد کا جوش پیدا کر دیا ہر جگہ سے مسلمان شرکت کے لئے آنے لگے، امید سے زیادہ فوجیں جمع ہو گئیں۔ حضرت سعد ابی وقاص اس فوج کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔ اور اُنھوں نے یہ بھاری لشکر، جس کی تعداد تیس ہزار تھی۔ لے کر عراق کا رُخ کیا۔

قادسیہ پہنچ کر ایرانیوں کو اسلام کی دعوت دی گئی مصالحت کی کوششیں آخر وقت تک کی گئیں، لیکن ایرانی مسلمانوں کی قوت سے ناواقف تھے۔ صلح کی کوششوں کو خاطر میں نہ لائے، اور جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ آخر قادسیہ ہی میں پہلا مورچہ جمایا گیا۔ تین دن تک بہت سخت لڑائی رہی دونوں طرف کی فوجیں بہت بہادری اور جوش سے لڑ رہی تھیں۔ تیسرے روز مسلمانوں نے دشمن کے قدم اُکھاڑ دئے اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

حضرت سعد یہاں سے بابل کی طرف بڑھے۔ راستے میں بڑے بڑے سرداروں نے خود بخود صلح وامان کی درخواست کی اور طرح طرح کی سہولتیں پہنچائیں۔ بابل آسانی سے فتح ہو گیا مسلمانوں

نے بہرہ شیر کی طرف قدم بڑھائے۔ اُسے بھی دو مہینے کے محاصرے کے بعد سر کرلیا۔ اب دار السلطنت یعنی مدائن کی باری تھی۔ بیچ میں دریائے دجلہ پڑتا تھا۔ دشمنوں نے تمام پل بے کار کر دئے تھے۔ مگر حضرت سعد کے اسلامی جوش کے آگے ان رُکاوٹوں کی کیا حقیقت تھی۔ انھوں نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اپنے سپہ سالار کو دیکھ کر فوج بھی پیچھے پیچھے چلی اور سب کے سب بڑے اطمینان سے باتیں کرتے کنارے پہنچ گئے۔ مسلمانوں کا یہ جوش و استقلال دیکھ کر دشمنوں پر دہشت چھا گئی۔ اور" دیوان آمدند" کہتے ہوئے بھاگے۔ تھوڑی سی فوج باقی رہ گئی تھی اُسے مسلمانوں نے آسانی سے شکست دے دی اور مدائن پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ حضرت سعد نے جلولا اور تکریت پر بھی چڑھائی کی اور دونوں مقامات پر مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ اس طرح ان کی یہ فوجی مہم ختم ہوئی۔

حضرت عمرؓ نے اس فتح کئے ہوئے علاقے کا انتظام بھی ان ہی کے سپرد کر دیا تھا ان میں سپہ سالاری کے ساتھ ساتھ حکومت اور انتظام کی صلاحیت بھی تھی یہ خدمت بھی انھوں نے کامیابی کے ساتھ انجام دی۔ تمام عراق کی مردم شماری اور پیمائش کرائی۔ جزیہ اور لگان کے قاعدے بنائے۔ اور رعایا کے آرام و آسائش کا پورا انتظام کیا۔ انھوں نے اپنی خوش خُلقی اور شفقت کے برتاؤ سے عجمیوں کے دل پر قبضہ کرلیا۔ بہت سے بڑے بڑے لوگ

اُن کی خوش اخلاقی سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔

حضرت عمرؓ کے حکم سے انھوں نے "کوفہ" کے نام سے عربی قبیلوں کا ایک شہر بھی بسایا۔ ایک ایک قبیلے کو ایک ایک محلے میں آباد کیا۔ شہر کے بیچوں بیچ شان دار مسجد بنوائی۔ اس میں چالیس ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی۔ مسجد کے پاس اپنا محل اور بیت المال تعمیر کرایا۔ عرصے تک بڑے انتظام اور قابلیت کے ساتھ اس صوبے پر حکومت کرتے رہے لیکن کچھ دنوں بعد لوگوں کو اُن سے شکایتیں پیدا ہو گئیں۔ یہ شکایتیں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچائی گئیں۔ حضرت عمرؓ کو اُن کی بے گناہی کا یقین تھا۔ تحقیق کرنے پر اور بھی قلعی کھُل گئی۔ لیکن اُنھوں نے مصلحتاً ان کی جگہ دوسرا شخص اس صوبے کا حاکم مقرر کر دیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے انتقال سے پہلے خلافت کی صلاحیت رکھنے والوں میں ان کا نام بھی لیا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "کم سے کم ان کی خدمات اور مشوروں سے ضرور فائدہ اُٹھایا جائے میں نے اُنھیں خیانت یا کسی جرم کی وجہ سے اُن کے منصب سے علیحدہ نہیں کیا ہے۔"

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو اُنھیں پھر کوفے کا گورنر بنا دیا۔ تین سال تک اس عہدے پر رہے اس کے بعد اُنھوں نے اپنی ساری زندگی گوشہ نشینی میں گذاری۔ مدینے سے دس میل کے فاصلے پر گھر بنوالیا تھا۔ اُسی میں رہتے تھے۔ آخر اسی

گوشہ نشینی کی حالت میں ۵۵ھ ۶۷۴ء میں انتقال کیا اور مقامِ البقیع میں دفن ہوئے۔

حضرت سعد وقاص کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہے۔ محدثین کی تحقیق کے مطابق اسلام لانے والوں میں ان کا نمبر ساتواں یا آٹھواں ہے اپنے متعلق خود فرماتے ہیں:۔

"میں عرب میں سب سے پہلا شخص ہوں جس نے خدا کی راہ میں تیر اندازی کی ہے ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے ساتھ درخت کے سوکھے پتے کھا کھا کر لڑے تھے"

پر سچ ہے سوکھے پتے کھا کھا کر جان جوکھوں میں ڈالنے والوں ہی کی وجہ سے قومی زندگی کی کھیتی لہلہاتی ہے اور ملت کے باغ میں بہار آتی ہے۔

خالد بن ولید (سیف اللہ)

حضرت خالد بن ولیدؓ مکے کے ایک اونچے گھرانے سے تھے۔ خود بھی عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ لڑائی کے فن میں ماہر تھے، اور مسلمان ہونے سے پہلے مسلمانوں اور خود آں حضرتؐ کے سخت دشمن تھے۔ قریش نے مسلمانوں کے خلاف جو لڑائیاں کیں ان میں یہ قریش کے ساتھ شریک تھے۔ اُحد کی لڑائی میں مسلمانوں کو شکست ان ہی کی ایک جنگی چال سے ہوئی آخر حدیبیہ کی صلح کے بعد یہ حضرت عمرو بن عاصؓ کے ساتھ خود مدینے میں آکر اسلام لائے۔ آں حضرتؐ نے انھیں دیکھا تو مسلمانوں سے فرمایا کہ "مکّے نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمھاری طرف پھینک دئے ہیں"

ان کے مسلمان ہونے کے بعد مسلمانوں کا ایک لشکر حضرت

زید بن حارثہ رضؓ کی سرداری میں شام کی طرف جا رہا تھا۔ آپؐ نے حضرت خالد رضؓ کو بھی ساتھ کر دیا۔ موتہ کے مقام پر عیسائیوں کے ایک بڑے لشکر سے اس فوج کی مڈھ بھیڑ ہوئی۔ لڑائی میں حضرت زید بن حارثہ رضؓ شہید ہو گئے۔ اُن کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب رضؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضؓ امیر بنتے اور شہید ہوتے گئے۔ آخر میں حضرت خالد رضؓ سردار بنائے گئے۔ یہ ایسی بہادری اور جوش سے لڑے کہ اُس دن سات تلواریں اُن کے ہاتھ سے ٹوٹیں۔ دوسرے دن عیسائیوں کو شکست دی اور فوج کو اُن کے نرغے سے نکال لائے۔ آں حضرتؐ نے اس کارنامے پر اُنھیں سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا خطاب دیا۔ آپؐ اُن کی سرداری میں وقتاً فوقتاً فوجیں بھیجتے رہے تھے۔ مکے کی لڑائی میں یہ آپؐ کے ساتھ تھے۔ آپؐ نے اُنھیں فوج کے ایک حصے کا سردار بنا کر حکم دیا تھا کہ دوسرے راستے سے مکے میں داخل ہوں۔ راستے میں کچھ نوجوان اُن کے مقابلے میں آئے اور دس بارہ لاشیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حنین کی لڑائی میں بھی آپؐ کے ساتھ تھے آپ نے اُنھیں تبلیغ کی غرض سے بھی کئی جگہ بھیجا۔

آں حضرتؐ کی وفات کے بعد بعض عربی قبیلوں میں پھر بے دینی پھیلنے لگی کچھ لوگ تو پیغمبری کا دعویٰ کر بیٹھے۔ ایک

شخص طلیحہ آپؐ کی زندگی کے آخر سال میں نبی بن بیٹھا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد اس کا فتنہ اور بڑھ رہا تھا۔ چند قبیلے تھے تو مسلمان، پر زکوٰۃ دینے سے انکار کرتے تھے ہمارے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے حضرت خالد رضؓ کی افسری میں فوجیں ادھر اُدھر بھیجیں۔ حضرت خالد رضؓ نے بڑی کوششوں سے اس فتنے کو مٹایا۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر رضؓ نے انھیں ایرانیوں کے مقابلے میں عراق بھیجا۔ یہاں اس وقت ایرانی حکومت تھی۔ حضرت خالد رضؓ نے یہاں قریب قریب ہر موقع پر تھوڑے سے مسلمانوں سے ہزاروں لاکھوں کی فوج کو شکست دی۔ روپے پیسے میں ضرور طاقت ہوتی ہے مگر سچ میں اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ حق کے حامی دوسری طاقتوں کے سامنے نہیں رُکتے۔ آخرکار یہ سلطنت ہی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ وہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔

عراق کی طرح شام پر بھی دوسری قوم یعنی عیسائیوں کی حکومت تھی حضرت ابوبکر رضؓ نے یہاں بھی فوج بھیجی تھی۔ یہ عیسائیوں کی بہت بڑی فوج کا مقابلہ کر رہی تھی۔ حضرت ابوبکر رضؓ نے حضرت خالد رضؓ کو بھی حکم دیا کہ عراق کی فوج کا سردار مثنّٰی بن حارثہ کو بنا دیں اور شامی لشکر کی امداد کے لئے کچھ فوج لے کر چلے جائیں۔ حضرت خالد رضؓ چھ ہزار فوج کے ساتھ شام پہنچ گئے۔ یہاں انھیں بڑی معرکے کی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ یرموک کی لڑائی خاص اہمیت رکھتی ہے، پچیس ہزار

مسلمانوں کے مقابلے میں دو لاکھ فوج تھی۔ مسلمان بہت بہادری سے جی توڑ کر لڑ رہے تھے۔ اسی زمانے میں حضرت ابوبکرؓ نے انتقال فرمایا اور حضرت عمرؓ ان کی جگہ خلیفہ ہوئے انھیں چند باتوں میں حضرت خالدؓ سے اختلاف تھا اس لئے انھیں فوج کی سرداری سے الگ کردیا۔ یہ حکم جب پہنچا ہے تو لڑائی بہت زوروں سے جاری تھی اس لئے اسے چھپا دیا گیا کہ بُرا اثر نہ پڑے۔ مسلمانوں کو فتح ہو گئی تو اس کا اعلان کیا گیا۔ حضرت خالدؓ نے خندہ پیشانی کے ساتھ اسے قبول کیا اور حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کی ماتحتی میں کام کرتے رہے۔ اب بھی کوئی مشکل آ پڑتی تو ان ہی کے مشورے پر عمل کیا جاتا تھا۔

مسلمان ہونے کے بعد تقریباً حضرت خالدؓ کی پوری زندگی جہاد ہی میں گذری۔ کوئی معمولی سے معمولی لڑائی بھی نہیں بتائی جا سکتی جس میں اُنھیں شکست ہوئی ہو یہ فخر بہت کم سپہ سالاروں کو نصیب ہوتا ہے۔

زندگی کے آخری زمانے میں حضرت خالدؓ شام ہی میں رہ پڑے۔ یہیں ۲۲ھ میں انتقال کیا ان کا مزار اب بھی حمص میں موجود ہے لوگ برابر زیارت کو جاتے ہیں۔ مزار پر ایک خاص ہیبت اور وقار ٹپکتا ہے۔ زیارت کرنے والے اکثر مسلمان ہوتے ہیں۔ اپنے اس بڑے فاتح سپہ سالار کی خاک کے سامنے پہنچتے ہیں تو شرم سے آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں کہ وہ قومی عظمت کا قائم کرنے والا تھا اور یہ اس کے برباد کرنے والے ہیں۔

محمد بن قاسم

محمد بن قاسم مشہور مسلمان حاکم حجاج بن یوسف کا چچا زاد بھائی تھا۔ بچپن ہی میں ہونہاری کی باتیں اُس میں پائی جاتی تھیں۔ آگے چل کر حجاج نے بھی اس کی طرف خاص توجہ کی۔ اپنی لڑکی سے اُس کی شادی کر دی اور ابھی بہت کم عمر تھا کہ اُسے فارس کا کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے کہ اس کے ساتھ کے لڑکے کھیل کود میں رہے اور اُس نے بہادروں اور سرداروں پر حکومت اور سرداری کی۔

جس وقت اُسے حجاج نے ہندوستان پر چڑھائی کا حکم دیا ہے بہت ہی کچی عمر تھی مشکل سے ۱۸ برس کا ہو گا۔ اس وقت ولید بن عبدالملک مسلمانوں کا خلیفہ تھا۔ ہندوستان پر چڑھائی کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ سراندیپ کے جزیرے میں جن مسلمان عربوں کا انتقال ہو گیا تھا ان کے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں اور اُن

کے ساتھ کچھ قیمتی تحفے وہاں کے راجہ نے حجاج کے پاس بھیجے۔ راستے میں راجہ داہر کی فوجوں نے جہاز لوٹ لئے اور عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا۔ حجاج نے راجہ داہر سے ان قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اُس نے انکار کیا۔ اس پر خلیفہ ولید کی منظوری سے حجاج نے دوبار یہاں فوجیں بھیجیں ان فوجوں نے شکست کھائی تیسری بار اس نے یہ مہم اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کے سپرد کی۔

وہ حجاج کی ہدایت کے مطابق پہلے شیراز آیا اور شیراز سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ حجاج نے دوسری فوجیں اور رسد کا سامان سمندر کے راستے سے اس کے پاس بھیجا۔ پہلے شہر دیبل فتح ہوا پھر مسلمانوں نے شہر قندپور پر قبضہ کیا پھر ارمائل پر یہ شہر بڑی دقتوں سے فتح ہوا۔ اس شاندار فتح سے سندھ میں مسلمانوں کے قدم جم گئے۔ اور اُنھوں نے وہاں رہنا بسنا شروع کر دیا۔ محمد بن قاسم نے ملتان میں ایک شان دار جامع مسجد تعمیر کرائی ارمائل کی فتح کے بعد مسلمان دوسرے مقامات پر یکے بعد دیگرے قابض ہوتے گئے۔ اس زمانہ میں سندھ کے علاقے کا حال اچھا نہ تھا حاکم نالائق اور ظالم رعایا ان کے ظلم سے تنگ، جب حالت یہ ہو تو رعایا اپنے حاکموں کا دل سے ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی لئے مسلمانوں کو سندھ کی لڑائی میں قدم قدم پر کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے سامنے ایک خاص مقصد اور ارادہ

تھا وہ جس ملک کا بھی رُخ کرتے تھے اس ارادے سے کہ اپنے اللہ اور رسول کا پیام پہنچائیں لوگوں کو نیکی، ایمانداری، شرافت، انسانیت رحم وہمدردی کا سبق دیں۔ برائیوں سے روکیں، بدنظمی کو دور کریں اور امن وعافیت پیدا کریں، آگے چل کر تمھیں معلوم ہوگا کہ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے سندھ کے ہندو مسلمانوں سے کیسے خوش تھے، خصوصاً محمد بن قاسم سے اُنھیں عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔

ان مقامات پر تسلّط اور ان کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد اُس نے ہندوستان کے شمال ومشرق کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا اس کے لئے اُس نے پچاس ہزار تازہ دم فوج جمع کی۔ مگر اس نئی مہم کی تیاریاں پوری ہو چکی تھیں کہ اُسے پہلے حجاج اور پھر خلیفہ ولید بن عبدالملک کے انتقال کی خبر ملی۔ سلیمان بن عبدالملک اس کی جگہ خلیفہ ہوا۔ اس تبدیلی کا اثر سندھ کی حکومت پر بھی پڑا۔ بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر محمد بن قاسم معزول کر دیا گیا اور یزید بن ابی کبشہ سکسکی اُس کی جگہ گورنر بنا کے بھیجا گیا۔

سندھ کے اس نوجوان فاتح نے خاموشی سے یہ حکم قبول کیا اور حلم، بردباری اور اطاعت شعاری کا وہ نقش دلوں پر چھوڑ گیا جو اس کی تمام فتوحات کی یاد سے زیادہ پائدار ہے۔ وہ عراق عجم کے شہر واسط میں قید کر دیا گیا اور آخر وہیں قتل کیا گیا یا بعض لوگوں کے نزدیک اپنی موت مرا۔

محمد بن قاسم ایک نہایت جری دلیر منتظم سمجھ دار اور نہایت شریف انسان تھا۔ اس نے اہل سندھ کے ساتھ نہایت نرمی اور فیاضی کا برتاؤ کیا ان کے پہلے کے رسم و رواج اور قانون میں کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جو اُنھیں ناگوار یا فتح کرنے والے کی زبردستی معلوم ہو، تین سال کے اندر اندر اُس نے امن قائم کر دیا، رعایا کی خوش حالی اور بہبود کے لئے قانون جاری ہوئے اور یہ نوجوان سندھ کے لوگوں میں بہت محبت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔

اس کی بے تعصبی، ہر دل عزیزی اور انتظامی قابلیت کا سب سے عمدہ ثبوت یہ ہے کہ اتنے تھوڑے زمانے میں اُس نے خود سندھ کے رہنے والوں کی ایک بڑی فوج بنالی اور اُن فوجوں کے علاوہ جو جا بجا چھاونیوں میں تھیں پچاس ہزار تازہ دم سپاہی ملتان میں جمع کر لئے۔ اس کی نیکی نرمی و شرافت ہر موقع و محل پر ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ جو لوگ لڑائی میں حصہ نہ لیتے تھے۔ ان کے ساتھ ہمیشہ امن و سکون کا برتاؤ کرتا تھا لڑائی کے موقع پر بھی کوئی ایسی بات نہ کرتا تھا جو قانون کے خلاف ہو۔ مذہبی پیشواؤں اور برہمنو کے ساتھ ہمیشہ رواداری اور عزت کا سلوک کرتا تھا۔ مغلوب رعایا سے ہمیشہ ہمدردی اور مہربانی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ مغلوب راجاؤں کو بھی محض خراج یا جزیہ دینے پر معاف کر دیتا تھا اور اُن سے صلح کر لیتا تھا۔ غرض تلوار کا یہ دھنی کوئی ظالم و جابر

فاتح نہ تھا بلکہ دنیا کا خادم اور انسانیت کا سیوک تھا جس کی حکومت کا سکہ جان اور دل پر تھا یہ اُن تلوار والوں میں تھا جن کی تلوار سے کچھ جانیں ضرور جاتی ہیں پر اس لئے کہ دوسرے زیادہ اور پوری طرح زندہ رہ سکیں، جن کے ہاتھوں کچھ بستیاں کچھ دنوں کو ضرور اُجاڑ ہوتی ہیں لیکن اس لئے کہ زیادہ بستیاں زیادہ دن تک آباد ہوں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

عمر بن عبدالعزیزؒ بنی امیہ یعنی قریش کے خاندان سے ہیں۔ ان
کی ماں امّ عاصم حضرت عمرؓ کی پوتی تھیں۔ یہ اموی خاندان کے
مشہور خلیفہ عبدالملک کے بھتیجے تھے ۶۶ھ ۶۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان
کے زمانے میں کئی صحابہ زندہ تھے۔ جو کوئی آں حضرتؐ کی وفات کے
بعد پیدا ہوا اور اُس نے کسی صحابی کو دیکھا ہو تو وہ تابعی کہلاتا ہے۔
انھیں بھی تابعی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ان کے باپ عبدالعزیز مصر
کے گورنر تھے۔ انھوں نے پوری توجہ سے اپنے ہونہار بچے کی تعلیم و
تربیت کی۔ ایک مشہور بزرگ حضرت صالح بن کیسان ان کی نگرانی
کے لئے مقرر کئے گئے۔ حضرت عمرؒ نے قرآن پاک بچپن ہی میں حفظ
کرلیا۔ پھر شعر و شاعری اور ادب سیکھا۔ حدیث کا علم کئی صحابہ اور محدثین
سے حاصل کیا۔ اس زمانے کے بڑے بڑے مشہور عالم حدیث میں
ان کی قابلیت کو مانتے تھے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد خناصرہ اور پھر مدینے کے گورنر بنادئے گئے۔ گورنر ہوکر مدینے پہنچے تو شہر کے تمام عالموں کو بلا کر کہا کہ "سلطنت کے انتظام کے بارے میں آپ مجھے مشورہ دیں کوئی افسر مسلمانوں پر ظلم کررہا ہو تو مجھے خبر کریں،، تمام عالم اس تقریر سے بہت خوش ہوئے۔ مدینے میں مسجد نبوی اور آں حضرت ؐ کے روضے کی شان دار عمارتیں ان ہی کے اہتمام اور نگرانی میں تیار ہوئیں۔ پھر مکے اور مدینے کے راستے میں بہت سے کنویں کھدوائے، پہاڑی راستے درست اور صاف کرائے اور دوسرے مفید کام کئے۔ خلیفہ کے حکم سے حاجیوں کے امیر بھی مقرر ہوئے۔ بہت سے غریبوں کو حج کرایا۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک کو ان پر بہت بھروسہ تھا۔ اپنی لڑکی فاطمہ کی شادی بھی ان سے کردی تھی۔ مرتے وقت خلافت کی وصیت بھی اُن ہی کے لئے کر گیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلافت کی خوش خبری سنائی گئی تو ممبر پر کھڑے ہو کر کہا:-

"لوگو! خلافت کا بوجھ میری مرضی لئے بغیر مجھ پر ڈال دیا گیا ہے۔ نہ تو مجھ سے رائے لی گئی نہ میں نے اپنی خواہش ظاہر کی۔ نہ عام مسلمانوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا اس لئے میری بیعت کی رسّی جو تمھاری گردنوں میں ہے

میں اُسے خود نکال لیتا ہوں اب تمھیں اختیار ہے جسے چاہو خلیفہ بناؤ۔"

سب نے کہا۔ ہم نے آپ کو خلیفہ منتخب کیا۔ اور آپ کی بیعت پر راضی ہیں یہ سُن کر خدا کی حمد و ثنا کے بعد ایک پُرجوش تقریر کی اور فرمایا۔

"لوگو! جو شخص خدا کی بندگی بجا لائے اُس کی اطاعت لازم ہے پر جو اُس کی نافرمانی کرے اس کا حکم ماننا جائز نہیں۔ جب تک میں خدا کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو۔ اگر میں اُس کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت و فرماں برداری تم پر لازم نہیں"

خلیفہ ہونے کے بعد انھوں نے شان و شوکت کی زندگی بالکل چھوڑ دی۔ بہت سادہ طریقے سے رہنے لگے۔ خلافت کے عالی شان محل میں بھی رہنا قبول نہ کیا۔ اپنا معمولی مکان کافی سمجھا۔

اموی خاندان کے خلیفہ کبھی کبھی مسلمانوں پر زیادتیاں کرتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ مسلمانوں کا مال طرح طرح سے غصب کر لیتے تھے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس طرح کی چھینی ہوئی ساری دولت مسلمانوں کو لوٹا دی وہ خود اسی خاندان سے تھے اور اُن کے پاس کئی ہزار روپے سالانہ کی جائداد تھی انھوں نے یہ سب جائداد یہاں تک کہ بیوی کی لونڈی

اور اپنے ہاتھ کی انگوٹھی تک واپس کر دی۔ اپنے گذارے کے لئے بس تھوڑی سی جائداد رکھ لی۔ یہ ان کی ذاتی ملکیت تھی اور اس کی آمدنی چند سو درہم سالانہ تھی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صرف دو سال یا پانچ مہینے حکومت کی۔ خلافت کے انتظام میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اُن کی درستی اور اصلاح کے لئے یہ مدت بہت تھوڑی تھی۔ پر انھوں نے اسی تھوڑے سے وقت میں ایسے ایسے کام کئے کہ حیرت ہوتی ہے۔ پرانے پرانے افسروں کو نکالا۔ اُن کی جگہ دین دار حاکم مقرر کئے۔ لگان جزیہ اور ٹیکس کا انتظام بہت خراب ہو گیا تھا اس کی اصلاح کی۔ علاوہ ان کے رفاہ عام کے اور بہت سے کام کئے۔ راستوں پر سرائیں بنوائیں۔ لنگر خانہ کھلوایا جہاں غریبوں، فقیروں اور مسافروں کو کھانا مفت دیا جاتا تھا۔ ان کی خلافت سے پہلے نومسلموں سے جزیہ لیا جاتا تھا انھوں نے بالکل بند کر دیا اور حکم دے دیا کہ مسلمان ہونے کے بعد کسی سے جزیہ نہ لیا جائے۔

بنو امیہ کی خلافت میں مذہب کا اثر کچھ کمزور ہو چلا تھا اور بہت سی برائیاں پھیل رہی تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بہت سختی سے ان کی روک تھام کی پر ان کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ حدیث کا علم مٹنے سے بچا لیا جو ابھی تک صحابہ اور عالموں کے سینوں ہی میں تھا۔ اور صحابہ رفتہ رفتہ دنیا سے رخصت ہو رہے

تھے۔ خطرہ تھا کہ کہیں یہ علم ہی نہ مٹ جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام حدیثوں کے لکھنے اور جمع کرنے کا حکم دیا، اور حدیث کے یہ مجموعے تمام ملک میں تقسیم کرائے۔ علمار کو مذہبی علوم کی طرف توجہ دلائی۔ علم کو عام کرنے کے لئے علمار کو حکم دیا کہ مسجدوں میں بیٹھ کر حدیث اور فقہ پڑھائیں۔ اُن کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا کہ اطمینان سے اپنا کام کریں۔ دوسرے علوم وفنون کی طرف بھی توجہ کی۔ طب کی ایک کتاب کی (جس کا ترجمہ مروان کے زمانے میں ہو چکا تھا) چالیس نقلیں کرا کے ملک کے مختلف حصوں میں تقسیم کرائیں۔

مغصوبہ (چھینی ہوئی) جائداد کی واپسی کا سب سے زیادہ اثر خود اُن کے خاندان پر پڑا۔ یعنی انھیں بھی اپنی تمام زمینیں اور جائدادیں واپس کرنا پڑیں۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ اور ایسی باتیں پیش آ گئیں کہ سارا خاندان ان کا مخالف بلکہ جانی دشمن بن گیا یہ لوگ کھلم کھلا تو کچھ کر نہیں سکتے تھے بس ترکیب یہ کی کہ روپئے کا لالچ دے کر ان کے ایک غلام کو ملا لیا اور اُسی کے ذریعے زہر دلوا دیا۔

حضرت عمرؓ کو زہر کا احساس ہوا تو غلام سے پوچھا اُس نے جو سچی سچی بات تھی۔ اُگل دی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایسے سنگین جرم پر اُسے کوئی سزا نہ دی۔ ہاں جو روپئے اُسے اس شرارت کے لئے ملے تھے وہ بیت المال میں داخل کرا دیئے اور اُس سے کہا کہ "ایسی جگہ چلا جا جہاں پھر کوئی تیری صورت نہ دیکھے"

آخر اسی زہر کے اثر سے ۱۰۱ھ؁ ۷۱۹ء؁ میں انتقال کیا۔ ۳۹ سال عمر پائی۔ مرتے وقت ان کے پاس کُل چودہ دینار نکلے ان میں سے بہت سی رقم تو تجہیز و تکفین میں خرچ ہو گئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی زندگی صحیح معنوں میں خلفائے راشدین کی زندگیوں کا نمونہ تھی وہی سادگی وہی دیانت وہی خلوص اور وہی ایثار۔ گھر کا خرچ صرف دو درہم روزانہ تھا وہ بھی اپنی ذاتی آمدنی۔ اور یہ آمدنی خلافت کے بعد بہت گھٹ گئی تھی۔ رہنے کا مکان بہت معمولی تھا۔ کھانے میں بس دال روٹی۔ کپڑوں میں اکثر پیوند لگے رہتے اولاد سے بہت محبت تھی پر یہ بھی غریب باپ کی غریب اولاد کی طرح غریبی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ دنیا سے بڑے بڑے حاکموں اور بادشاہوں کی یاد دیکھتے دیکھتے مٹ جاتی ہے۔ جن کے جبر و ظلم کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دنیا لرزتی ہے چند دن بعد کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا۔ مگر جو بادشاہی میں فقیری کرتے ہیں جو اپنی قوت اور اقتدار کو دوسرے انسانوں کی خدمت کا موقع جانتے ہیں یعنی جو خالی بادشاہ اور حاکم ہی نہیں ہوتے آدمی بھی ہوتے ہیں اُنھیں دنیا اپنا محسن سمجھتی ہے اور انھیں بھلانا چاہے تو نہیں بھول سکتی۔ عمر بن عبدالعزیز ایسے ہی آدمی تھے۔

طارق بن زیاد

اسپین میں ایک مقام ہے جبرالٹر یہ اصل میں جبل الطارق کا بگڑا ہوا نام ہے۔ یہ مقام طارق نے فتح کیا تھا اور اسی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ طارق بن زیاد مسلمانوں کا بہت بڑا سپہ سالار تھا۔ مسلمانوں کے جب اچھے دن تھے تو بے شمار، ایسے لوگ پیدا ہوتے تھے جو بس اپنی اہلیت، صلاحیت، مذہب سے خلوص انسانوں کی خدمت کے سچے جذبے اور ہمت و دلیری کی بدولت بڑے بنتے تھے اور لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اس کے حسب نسب اور وطن کے بارے میں اختلاف ہے پر ہمیں تو اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ بہت جری، بہادر اور سمجھ دار سپہ سالار تھا اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ حملے کے وقت دشمن کے ہتھیاروں کو بے کار اور اس کی طاقت کو تباہ و برباد کر دیتا تھا۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے سپہ سالاری کے درجے

تک پہنچ گیا تھا۔

موسیٰ بن نصیر مصر کا گورنر تھا اور اسپین فتح کرنے کا خیال برابر اُس کے دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔ یہی خیال دل میں لئے وہ اپنے سپہ سالار طارق بن زیاد اور پر جوش مسلمانوں کی بہت سی فوج کے ساتھ سبتہ آیا۔ یہاں کے بادشاہ نے اُس کی بہت آؤ بھگت کی۔ بہت سے تحفے تحائف اس کی خدمت میں پیش کئے۔ اس کی اطاعت اور اُسے جزیہ دینا قبول کیا۔ یہ دیکھ کر بربر قوم کے اور جتنے قبیلے تھے اُنھوں نے بھی امان طلب کی۔

اب سامنے یورپ تھا جہاں خدا کا پیام اور اچھی انسانی زندگی کا نمونہ پہنچانا تھا۔ اس زمانے میں اسپین کی حالت خاص طور پر خراب تھی۔ حکومت کی بد انتظامی۔ آئے دن کے آپس کی جھگڑوں۔ فتنہ و فساد حاکموں کے ظلم اور زبردستی نے سارے ملک کو ویران و تباہ کر دیا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کو اسی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ طارق نے پہلے اس ملک کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل کیں اور پھر خدا کا نام لے کر جزیرہ خضرا کی طرف بڑھا۔ اُدھر روڈریک اسپین کے بادشاہ کو بھی اس حملے کی خبر ہو چکی تھی۔ اس نے امیروں اور وزیروں سے اس بارے میں مشورہ کیا اور آخر رائے یہ قرار پائی کہ عربوں کا مقابلہ کیا جائے۔ ایک لاکھ فوج بھی آسانی سے جمع کر لی گئی۔ مگر

بارہ ہزار تین سو مسلمانوں نے طارق کی سرداری میں ایک لاکھ دشمنوں کو شکست دے دی۔

طارق کے سپاہی بھی آدمی تھے اور روڈرک کے ساتھی بھی۔ پر طارق کے ساتھیوں کے سامنے دنیا کی اصلاح تھی۔ روڈرک کے حامیوں کے سامنے اپنی اغراض۔ ایک بے غرض آدمی ہزاروں غرض مندوں پر بھاری ہوتا ہے۔ بے غرضی اور خود غرضی کے معرکہ کی بڑی اچھی مثال طارق کا یہ حملہ تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اتنے بڑے لشکر کو دیکھ کر سہم جاتا اور اپنی فوج کو بچا کر نکال لے جانے کی تدبیر کرتا۔ مگر طارق نے کیا کیا؟ پہلے تو جتنی کشتیاں سمندر میں تھیں جلادیں کہ فوج کے دل میں واپسی کا خیال بھی نہ آئے۔ لوگوں نے پوچھا "یہ کیا نادانی ہے؟" جنگ کے ہمیشہ دو رُخ ہوتے ہیں۔ ہم اپنے دیس سے دور پردیس میں ہیں۔ پسپائی ہوئی تو کیسے لوٹیں گے؟ جانتے ہو طارق نے کیا جواب دیا؟ اس نے کہا دیس اور پردیس کیا۔ ہر ملک ہمارا ملک ہے اس لئے کہ ہمارے ہی خدا کا ملک ہے!

اس فتح کے بعد طارق آگے ہی بڑھتا گیا یہاں تک کہ شدونہ پہنچ گیا۔ شدونہ پر قبضہ کر کے مدور اور مدور سے چل کر اس چشمے پر گزرا جو اسی کے نام سے مشہور ہے یہاں سے وہ اشبیلیہ اور اشبیلیہ سے استنجہ پہنچا غرض شہر پر شہر فتح کرتا اسپین کے دارالسلطنت میں

پہنچ گیا اور اسی پہاڑی مقام جبل الطارق (جبرالٹر) سے حملہ کیا۔ حملے سے پہلے اُس نے آں حضرتؐ کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ کے آس پاس تمام صحابہ تلواریں سونتے کھڑے ہیں اور آپ فرمارہے ہیں "طارق اپنے کام کی طرف بڑھ" اس خواب سے اُس کے دل کو بڑی ڈھارس بندھی فوج والوں سے بیان کیا تو اُن کے دل بھی بڑھ گئے اور شہر بہت جلد فتح ہو گیا۔

اب اُس کی اتنی دھاک بیٹھ گئی تھی کہ اُتر دکھن، پورب پچھم جدھر بھی رُخ کرتا کامیابی قدم چومتی۔ وہ خود تو جبل الطارق سے بھی سات سو میل آگے نکل گیا اور اپنے ماتحت افسروں کو مختلف شہروں کو فتح کرنے کے لئے بھیجا۔ قرطبہ اور طلیطلہ دو مشہور شہر اسی طرح فتح ہوئے۔

موسیٰ کا تو ارادہ تھا کہ یورپ کے دوسرے علاقے بھی فتح کرے مگر خلیفہ کی طرف سے بے وقت بلاوے نے اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ورنہ لوگ اس وقت اپنے ملکی حالات سے اس قدر غیر مطمئن تھے کہ مسلمانوں کو اپنے لئے رحمت سمجھتے تھے۔ پھر ان کی بہادری اور شجاعت کا ایسا سکہ جم گیا تھا کہ جس طرف مسلمانوں کی تھوڑی سی فوج بھی پہنچ جاتی تھی۔ لوگ انھیں سردار مان لیتے اور اطاعت قبول کر لیتے تھے۔

افریقہ اور اسپین پر پورے طور پر قبضہ ہو گیا تو طارق اور موسیٰ بن نصیر نے عربوں کو ان دونوں جگھوں میں رہنے بسنے کی اجازت

دے دی اور سو ہی برس میں زراعت، تجارت، صنعت و حرفت
میں اتنی ترقی ہوئی کہ ملک مالا مال ہو گیا۔

طارق کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کا پتہ نہ چل سکا تاریخ
کی بعض کتابوں میں بس اتنا لکھا ہے کہ خلیفہ کے بلانے پر وہ شام
چلا آیا تھا۔ اور یہیں اُس نے انتقال کیا۔ بہر حال اس کی پیدائش
اور موت کی تاریخیں اتنی اہم نہیں جتنے اُس کی ہمت، جرأت، دلیری
اور خدا کی راہ میں فدا کاری کے وہ کارنامے جو رہتی دنیا تک یادگار
رہیں گے اور نسلہا نسل تک دلوں کو گرمائیں گے۔

امام اعظم حضرت ابو حنیفہ رح

تم نے ان کے حالات نہ پڑھے ہوں گے تو نام تو ضرور سنا ہو گا ہمارے ہندوستان کے اکثر مسلمان انھیں اپنا امام مانتے ہیں اور روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ ان ہی کے بتائے ہوئے طریقوں پر ادا کرتے ہیں۔ یہ ۸۰ھ/۶۹۹ء میں کوفے میں پیدا ہوئے ان کے باپ ریشمی کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ امام صاحب نے ہوش سنبھالا تو اسی کام میں لگ گئے۔ پر اللہ تعالےٰ ان سے اسلام کی خدمت لینا چاہتا تھا۔ یہ زمانہ مسلمانوں کی ترقی کا تھا گھر گھر علم کا چرچا تھا۔ ایک بزرگ نے انھیں جوہر قابل دیکھ کر پڑھنے لکھنے کی نصیحت کی یہ نصیحت امام صاحب کے دل میں گھر کر گئی۔ بہت توجہ اور شوق سے پڑھنے لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ اُس زمانے کے مشہور محدثین[1]

---

[1] محدث۔ حدیث کا علم جاننے والا محدثین جمع۔

سے حدیث پڑھی۔ مشہور فقیہ[1] حضرت حماد سے فقہ کا علم سیکھا ان کے استاد ان کی غیر معمولی قابلیت کے سبب طالب علمی ہی کیں ان کا ادب کرنے لگے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد رفتہ رفتہ ان کی علمی شہرت دور دور پھیل گئی۔ اسلامی فقہ اور شریعت کے مسئلوں میں انھوں نے ایک خاص طریقہ اختیار کیا جس کے ماننے والے اسی زمانے میں پیدا ہو گئے تھے۔

امام مالک رحؒ اور امام احمد بن حنبل رحؒ کی طرح امام صاحب کو بھی آزمائشوں میں مبتلا ہونا پڑا۔ پہلے بنو امیہ کے زمانے میں امیر عراق نے انھیں کوفے کا قاضی بنانا چاہا۔ انھوں نے انکار کیا۔ اس نے ان پر بہت سختی کی۔ کوڑے لگوائے، ہاتھوں اور پیروں میں بھاری بھاری زنجیریں ڈلوائیں اور قید خانے میں بھجوا دیا۔ اسی قید کی حالت میں والدہ ان سے ملنے آئیں اور کہا "نعمان ایسا علم کس کام کا جس سے تجھے سوائے قید و بند کے کچھ حاصل نہ ہوا"۔ انھوں نے کہا "اچھی اماں! اگر میں اس علم سے دنیا کا فائدہ اٹھاتا تو یہ سختیاں نہ جھیلنی پڑتیں لیکن میں نے اللہ کی مرضی اور علم کی حفاظت کو بہتر جانا اور علم کا فنا ہونا گوارا نہ کیا"۔ اسی طرح عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے بلا کر قاضی کا عہدہ پیش کیا اور قسم کھائی کہ "میں تمھیں قاضی ضرور بناؤں گا"

---

[1] فقیہ۔ فقہ کا علم جاننے والا فقہا جمع

کوئی دوسرا ہوتا تو پھولا نہ سماتا کہ لو بھئی قسمت کھل گئی اتنا بڑا خلیفہ ایسے اصرار سے یہ عہدہ پیش کر رہا ہے۔ مگر امام صاحب تو عزت کے بھوکے تھے نہ روپئے کے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ نوکری تو آخر غلامی ہے اور غلامی کے بعد انسان میں حق بات کہنے کی جرأت کم رہ جاتی ہے۔ خلیفہ بھی یہی چاہتا تھا۔ امام صاحب کا اثر تو لوگوں پر تھا ہی وہ ڈرتا تھا کہ انھوں نے کوئی بات میرے خلاف کہہ دی تو عام لوگ میرے مخالف ہو جائیں گے۔ امام صاحب یہ بات خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے بھی قسم کا جواب قسم سے دیا۔ خلیفہ ناراض ہو گیا اور جیل خانے میں ڈلوا دیا۔ اب کے بھی قید میں بہت تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ آخر خلیفہ نے قید خانے ہی میں زہر دلوایا۔ یہ سجدے میں تھے کہ روح پرواز کر گئی کوئی ستر سال زندہ رہے ۱۱۵ھ / ۷۶۷ء میں انتقال کی خبر مشہور ہوئی تو خلقت ٹوٹ پڑی۔ پہلی بار نماز میں پچاس ہزار آدمی تھے۔ دن میں چھ بار نماز پڑھائی گئی۔ اور بیس روز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بغداد میں دفن کئے گئے کئی سو برس بعد سلطان الپ ارسلان نے ان کے مزار پر ایک قبہ اور اس کے قریب ایک مدرسہ بنوایا۔

امام صاحب بہت ہنسمکھ تھے۔ مگر چہرے سے وجاہت ٹپکتی تھی۔ لباس اچھا پہنتے تھے۔ ہمیشہ کپڑوں میں خوشبوئیں اور عطر ملتے تھے۔ بات چیت میں نرمی اور شیرینی تھی۔ طبیعت میں تواضع، انکسار اور

ہمدردی۔ اکثر خاموش، اور غور و فکر میں ڈوبے رہتے مگر کسی مسئلے پر گفتگو چھڑ جاتی تو چشمے کی طرح بہہ نکلتے۔ تنہائی میں ہمیشہ کلام پاک کی تلاوت کرتے اور ہر وقت باوضو رہتے۔ امام صاحب نے حضرت انسؓ بن مالک اور دوسرے صحابہ کو دیکھا ہے ایسے لوگوں کو تابعی کہتے ہیں اور یہ اس زمانے میں بڑی خوش نصیبی کی بات سمجھی جاتی تھی۔

امام صاحب تجارتی کاروبار میں پوری دیانت سے کام لیتے تھے۔ معاملے کی سچائی میں مشہور تھے۔ لین دین میں بھی ٹال مٹول سے سخت نفرت تھی۔

ایک بار کپڑے کے تھانوں میں کچھ عیب تھا۔ بیچنے والے کو تاکید کر دی گئی کہ خریدار پر یہ عیب صواب ظاہر کر دیا جائے لیکن اسے بیچتے وقت دھیان نہ رہا۔ امام صاحب کو خبر ہوئی تو بہت افسوس کیا اور تھانوں کی قیمت (۳۰ ہزار درہم) خیرات کر دی

ایک بار کسی بیمار کی عیادت کو جا رہے تھے راستے میں ایک شخص کترا کر نکل گیا امام صاحب نے بلا کر وجہ پوچھی اُس نے کہا "آپ کے دس ہزار درہم مجھ پر قرض ہیں اب تک ادا نہ کر سکا ہوں۔ سامنا کرتے شرم آتی ہے" امام صاحب اس کی غیرت و شرم سے بہت متاثر ہوئے اور سارا قرضہ اسی وقت معاف کر دیا۔

امام صاحب اپنے پڑوسیوں کا بڑا لحاظ رکھتے تھے ان کے گھر کے پاس ایک چمار رہتا تھا۔ دن بھر تو کام کرتا شام کو واپس

آتا تو دوست احباب کی مجلس گرم ہوتی شراب کا دور چلتا اور گانا بجانا ہوتا۔ ایک دفعہ اُس کے گھر میں خاموشی تھی۔ معلوم ہوا کہ پولس پکڑ لے گئی۔ امام صاحب شہر کے حاکم کے پاس گئے اور رہائی کی سفارش کی۔ حاکم نے ان کے احترام میں اس دن جتنے قیدی تھے سب چھوڑ دئے۔ امام صاحب نے روپیہ پیسہ سے بھی اس کی مدد کی نوجوان پر امام صاحب کے اخلاق کا بہت اثر ہوا گناہوں سے توبہ کی اور ان کے یہاں آنے جانے لگا۔ اور تھوڑے دنوں میں اچھا خاصا عالم اور فقیہ بن گیا۔

امام صاحب غیبت کو سخت ناپسند کرتے تھے مزاج میں صبر اور تحمل بھی بہت تھا۔ کبھی کسی کو اپنی زبان سے بُرا نہیں کہا۔ لوگ بازاری گالیاں تک دے بیٹھتے تھے مگر وہ ماتھے پر بل نہ لاتے تھے۔ ایک بار کوئی مسئلہ سمجھاتے وقت ایک عالم کی غلطی کی طرف اشارہ کیا اُن بزرگ کا کوئی معتقد وہاں بیٹھا ہوا تھا سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ اس کا جوش کچھ ٹھنڈا ہوا تو نہایت ضبط و تحمل کے ساتھ وہی لفظ دہرائے۔

امام صاحب کا دل بھی بہت نرم تھا۔ ایک دفعہ کسی کے کوٹھے سے گرنے کی خبر ملی۔ بس چیخ اُٹھے دوڑے دوڑے اُس کے گھر گئے اور بہت ہمدردی اور غمخواری کی اور جب تک اچھا نہ ہو گیا روز صبح کے وقت عیادت کو جاتے۔ مگر خود اس قسم کی ناگہانی آفتوں

میں مبتلا ہوتے تو بہت مستقل مزاجی سے کام لیتے۔ ایک بار چھت سے ایک سانپ گود میں آگرا لوگ بدحواس ہو کر ادھر اُدھر بھاگے مگر امام صاحب ہلے تک نہیں۔

امام صاحب استادوں کا بہت ادب کرتے تھے۔ امام مالک اُن سے تیرہ برس چھوٹے تھے مگر وہ اُن کے سامنے ایسے ادب سے بیٹھتے تھے جیسے استاد شاگرد کے سامنے۔ ان کے استاد حماد جب تک زندہ رہے ان کے مکان کے رُخ کبھی پیر پھیلا کر نہ سوئے۔

امام صاحب کی فقہ کو ماننے والے اُسی زمانے میں بہت ہو گئے تھے اکثر اسلامی ملکوں کے قانون اسی فقہ سے بنائے گئے۔ موجودہ جمہوریت سے پہلے ٹرکی میں بھی حکومت کا قانون حنفی فقہ کے مطابق تھا۔ اب بھی ترکی، عراق، فارس، افغانستان کے سب اور ہندوستان کے زیادہ تر مسلمان اسی حنفی فقہ پر چلتے ہیں۔

امام مالک

لوگ علم حاصل کرنے کے لئے اِدھر اُدھر کا سفر کریں گے مگر مدینے کے عالم سے بڑا کسی عالم کو نہ پائیں گے۔

(حدیث شریف)

حضرت ابو عبد اللہ مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اللہ اُن سے راضی ہو) علم حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ اسلامی شرع کی تفسیر میں جن چار اماموں کی ہم سب مسلمان پیروی کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ ان کے خاندان کا اصل وطن یمن ہے۔ ان کے پر دادا ۲ھ میں اسلام لائے۔ اور مدینے ہی میں بس گئے۔ امام صاحب ۹۳ھ (۷۱۱ء) میں مدینے میں پیدا ہوئے۔ مالک نام رکھا گیا ان کے دادا، باپ، چچا غرض سارا خاندان حدیث کا عالم تھا۔ خصوصاً والد اور چچا نے خاصی شہرت حاصل کی۔ امام صاحب نے اسی علمی فضا میں تعلیم و تربیت پائی۔

اس زمانے میں مدینہ طیبہ مسلمانوں کے مذہبی علوم خصوصاً

حدیث و فقہ کا مرکز تھا ان دونوں علموں کے بڑے بڑے فاضل موجود تھے۔ لوگ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ امام صاحب نے ان ہی بزرگوں سے فقہ اور حدیث پڑھی۔ ان کی تعلیم شروع سے آخر تک مدینے ہی میں ہوئی۔ کہیں باہر جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ پھر بھی طالب علمی کے زمانے میں بہت دقتوں کا سامنا رہا ایک بار خرچ کی تنگی کے سبب چھت کی کڑیاں تک بیچنا پڑیں۔ اُن کے ایک اُستاد کئی میل کے فاصلے پر رہتے تھے۔ یہ روزانہ جلتی دوپہری دھوپ اور لوہ میں ان کے یہاں پیدل جاتے۔ اسی محنت اور شوق کا تو نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں وہ علم اور کمال حاصل کیا کہ خود ان کے اُستاد ان پر رشک کرتے تھے۔ اللہ نے ان کے علم میں برکت بھی ویسی ہی دی۔ ان کے ذریعے حدیث کا علم خوب پھیلا۔ دور دور سے لوگ پڑھنے آتے اور اپنے ملکوں میں جاکر اس علم کو پھیلاتے تھے۔

امام صاحب حدیث بہت اہتمام سے پڑھاتے تھے۔ پہلے غسل کرتے بالوں اور کپڑوں میں تیل لگاتے جس جگہ پڑھاتے وہاں خوشبو کی انگیٹھیاں سلگائی جاتیں۔ قالین کا فرش ہوتا۔ بیچ میں امام صاحب تشریف رکھتے آس پاس شاگردوں کا مجمع ہوتا۔ چہرے سے وقار اور ہیبت ٹپکتی اور مجلس میں خاموشی چھائی رہتی۔

اس زمانے کے بڑے بڑے امیر بلکہ خلیفہ تک اُن کی شاگردی

کو فخر سمجھتے تھے۔ عباسی خاندان کے خلیفہ ابوجعفر منصور سے لے کر ہارون اور مامون تک اُن کے درس میں شریک ہوئے ہیں۔

حدیث کا علم اب تک صرف سینوں اور متفرق سفینوں میں محفوظ تھا۔ کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ امام صاحب نے پہلی بار موطا کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ اس میں وہ تمام حدیثیں جمع کر دیں جو بھروسے کے راویوں سے ان تک پہنچی تھیں۔ قرآن کے بعد مسلمانوں کی یہ پہلی کتاب تھی جو اس زمانے میں لکھی گئی۔ بعض علماء نے اسے حدیث کی مشہور کتاب صحیح بخاری پر ترجیح دی ہے امام صاحب نے دو ایک کتابیں اور بھی لکھی ہیں مگر یہ سب سے اہم ہے۔ ان ہی علمی فضیلتوں کی وجہ سے امام صاحب امام دارالہجرہ کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ اکثر عالموں کا خیال ہے کہ آں حضرتؐ کی حدیث (جو ہم عنوان کے نیچے نقل کر آئے ہیں) ان ہی کے بارے میں ہے۔

امام صاحب باوجود اس بلند علمی کے بہت بااخلاق تھے۔ لوگوں کے دُکھ درد شادی وغم میں شریک ہوتے تھے۔ لوگوں کے حقوق کا خیال رکھتے تھے۔ کوئی بیمار پڑ جاتا تو اُس کی عیادت کو جاتے مر جاتا تو جنازے میں شریک ہوتے۔ مرحوم کے رشتے داروں کو تسلّی و تشفی دیتے۔ امام شافعی ان کے شاگرد تھے مگر ان کے لئے کھانا اندر سے خود لاتے۔ بڑے سخی داتا تھے۔ ایک دفعہ امام شافعی نے اُن کے اصطبل

کے دو تین گھوڑوں کی تعریف کی امام صاحب نے پورا اصطبل اُنھیں دے دیا۔ عالموں کی بہت عزت کرتے تھے۔ کوئی بات معلوم نہ ہوتی اور اس کے بارے میں سوال کیا جاتا تو فوراً کہہ دیتے کہ مجھے نہیں معلوم۔ اپنی غلطی کا فوراً اعتراف کر لیتے۔ چغلی سے سخت نفرت تھی۔ فرماتے تھے کہ مدینے میں ایک قوم تھی اس میں کوئی عیب نہ تھا۔ لیکن اس نے دوسرے کے عیبوں پر نکتہ چینی کی اور اُن میں بھی عیب پیدا ہو گیا۔ اور کچھ لوگ ایسے تھے جن میں عیب تو تھے مگر اُنھوں نے دوسروں کے عیبوں سے واسطہ نہ رکھا۔ اس طرح اُن کے عیب بھی لوگ بھول گئے۔

امام صاحب کو آں حضرتؐ سے والہانہ محبت تھی۔ جب کبھی آپ کا ذکر آ جاتا چہرے کا رنگ بدل جاتا۔ اصطبل میں اچھے اچھے گھوڑے اور خچر تھے مگر مدینے میں کبھی سواری پر نہیں نکلتے۔ اس لئے کہ اس میں آں حضرتؐ کا جسم مبارک دفن ہے۔ بڑھاپے میں اپنے شاگردوں کے سہارے چلتے تھے مگر سواری پر بیٹھنا گوارا نہ کرتے تھے۔ پڑھنے پڑھانے سے جو وقت بچتا تھا۔ س میں بس عبادت کرتے تھے یا قرآن شریف پڑھتے تھے

امام صاحب اس قدر بااخلاق اور منکسر مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ خود دار بھی بہت تھے۔ امیروں اور بادشاہوں کا بس اتنا ہی ادب کرتے تھے جتنا مذہبی حیثیت سے ضروری تھا۔ عباسی خلفاء

کے دربار میں ہر شخص کے لئے خلیفہ کے ہاتھوں کو بوسہ دینا ضروری تھا۔ امام صاحب نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

ایک بار خلیفہ مہدی مدینے آیا اور امام صاحب کی خدمت میں تین ہزار دینار بھجوائے انھوں نے قبول کر لئے۔ پھر ان سے درخواست کی کہ میرے ساتھ دار الخلافہ بغداد تشریف لے چلئے۔ امام صاحب نے قاصد کے ذریعے کہلوایا "تمھاری اشرفیاں ویسی ہی رکھی ہیں جی چاہے منگوا لو پر میں مدینہ نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لئے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا "مدینہ ان کے لئے بہتر ہے کاش وہ جانتے" (حدیث شریف)

ایک بار مہدی نے اپنے دونوں بیٹوں ہادی اور ہارون کو حکم دیا کہ امام صاحب سے موطا پڑھیں۔ شاہزادوں نے امام صاحب کو بلا بھیجا۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ لوگ علم کے پاس آتے ہیں علم لوگوں کے پاس نہیں آتا آخر شاہزادوں کو خود آنا پڑا۔

امام صاحب جس بات کو حق سمجھ لیتے تھے اُس سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے ایک بار مدینے کے حاکم نے امام صاحب سے کوئی فتویٰ مانگا یہ فتویٰ حاکم کی مرضی کے خلاف تھا۔ اُس نے غصے میں آکر امام صاحب کے ستّر کوڑے لگوائے اور اتنا پٹوایا کہ دونوں ہاتھ اُتر گئے خلیفہ منصور کو اس کی اطلاع ہوئی تو حاکم کو فوراً معزول کر دیا اور حکم دیا کہ گدھے پر سوار ہو کر دار الخلافہ میں حاضر ہو۔

امام صاحب نے ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ/۷۹۵ء کو انتقال کیا۔ ان کے

شاگردوں معتقدوں اور تمام اسلامی دنیا کے لئے یہ ایک غمناک حادثہ تھا۔ مدتوں یہ غم اسلامی دنیا پر طاری رہا ایسے باعمل با اخلاق اور خوددار عالم قدرت پیدا بھی کبھی کبھی کرتی ہے۔ اور سچ پوچھو تو علم کی روشنی صحیح معنوں میں ایسے ہی لوگوں کی بدولت پھیلتی بھی ہے جو علم کی صحیح قدر و قیمت جانتے ہیں اور جن کی زندگی کا ہر پہلو انسانیت کے لئے بہت اچھا نمونہ ہوتا ہے۔

امام صاحب بہت بڑے فقیہ اور مجتہد بھی تھے آپ کی یعنی مالکی فقہ نے اندلس اور افریقہ میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ الجزائر اور مراکش وغیرہ میں اب بھی تمام مسلمان مالکی فقہ کو مانتے ہیں۔

عبدالرحمٰن الداخل

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد خلافت امیر معاویہ کے ہاتھ آ گئی تھی یہ بنی امیہ کے خاندان سے تھے۔ اس خاندان میں کوئی چودہ خلیفہ ہوئے ۱۳۲ھ میں عباسی خاندان نے حکومت اور خلافت ان سے چھین لی۔ دونوں خاندانوں میں عداوت تو پہلے سے تھی۔ خلافت پر قبضہ کرتے ہی یہ بنی امیہ کے خاندان والوں کو چن چن کر قتل کرنے لگے۔ اتفاق سے ایک شہزادہ عبدالرحمٰن بن معاویہ کسی طرح بچ نکلا۔ اور گرتا پڑتا مصیبتیں اُٹھاتا فلسطین پہنچ گیا۔ یہاں اُس کا ایک وفادار غلام بدر مل گیا۔ یہ دونوں بھیس بدل کر افریقہ پہنچے۔ افریقہ والوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہاں سے عبدالرحمٰن ملیلہ گیا، بدر کو اندلس بھیجا کہ وہاں کے شامیوں کو اس کی حکومت کے لئے ہموار کریں۔ بدر کو اس میں کامیابی ہوئی۔ وہ عبدالرحمٰن کو جہاز میں بٹھا کر بڑی شان سے اندلس لے گیا۔ اس وقت اندلس کا حاکم یوسف الفہری تھا۔ یہ بہت تجربہ کار اور کامیاب سپہ سالار تھا۔ اسے عبدالرحمٰن کی

اس طرح آنے اور اپنی حکومت کے لئے بیعت لینے کی خبر ہوئی تو بہت پریشان ہوا۔ اور شروع ہی میں اس فتنے کو کچلنے کی کوشش کی۔ پر عبدالرحمٰن کی طاقت اب اس قدر بڑھ گئی تھی کہ یوسف کو ناکامی ہوئی۔ کئی لڑائیوں کے بعد یوسف نے صلح کر لی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد معاہدہ توڑ دیا۔ اور ایک آخری لڑائی میں شکست کھا کر مارا گیا۔ اب عبدالرحمٰن کے لئے میدان صاف ہو گیا۔ لیکن ایک اور آفت اٹھ کھڑی ہوئی۔ عباسی خلیفہ منصور نے اس کے مقابلے کے لئے ایک بڑی فوج بھیج دی۔ پھر خود ملک میں کچھ قبیلے بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ مگر اس خوش نصیب اموی شاہزادے نے ان سب کو نیچا دکھایا۔ عباسیوں نے اس زمانے کے مشہور عیسائی شہنشاہ شارلیمان کو بھی اس کے خلاف ابھارا اس نے پوری طاقت سے چڑھائی کی پر اسے بھی منہ کی کھانا پڑی اور بہت سا نقصان اٹھا کر واپس گیا۔

ان دشمنوں کے علاوہ مختلف قبیلوں کے لوگ اور خود اس کے عزیز اور رشتہ دار آئے دن اس کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ لیکن وہ بہت سختی سے ان کا توڑ کرتا تھا۔ بھائی یا بھتیجے کسی کی بھی رعایت نہیں کرتا تھا۔ آخر ۱۷۲ھ ۷۸۸ء میں اٹھاون سال کی عمر میں تینتیس سال حکومت کے بعد قرطبہ میں انتقال کیا۔

اس حوصلہ مند بادشاہ نے غیر معمولی ہمت و استقلال سے زندگی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ ساری عمر مصیبت اور پریشانی میں کٹی۔ پر جس چیز کے لئے قدم اُٹھایا اُسے پورا ہی کر کے چھوڑا۔ سچ ہے ہمت اور استقلال کے سامنے پہاڑ بھی ٹل جاتے ہیں۔ اس کا بچپن عیش میں گذرا تھا پر جب مصیبت پڑی تو اسے بھی اُس نے خوشی سے جھیلا ان ہی مصیبتوں کو جھیلتے جھیلتے اس میں صبر و ضبط اور بہت سی خوبیاں پیدا ہو گئی تھیں۔

عبدالرحمٰن کو ملک کے انتظام میں مصروفیت کی وجہ سے فرصت کم ملتی تھی۔ پھر بھی جو وقت بچتا تھا اس میں اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔ تمام ملک میں پرانی سڑکوں کی پھر سے مرمت کرائی۔ نئی سڑکیں بنوائیں۔ ڈاک کا انتظام اور چوروں ڈاکوؤں کا بندوبست کیا۔ ملک کے انتظام کے لئے اچھے اچھے قانون بنائے۔ اکثر ملک کا دورہ کرتا رہتا تھا کہ افسروں کی کارگزاری اور اُن کا طرز عمل اپنی آنکھ سے دیکھے اور رعایا کی ضرورتوں سے واقف ہو۔ جہاں جہاں جاتا حاجتمندوں کی مدد کرتا۔ عام فائدے کے کاموں کے لئے بڑی بڑی رقمیں دیتا۔ بڑے بڑے محل اور مسجدیں بنواتا۔ تعلیم۔ علمی تحقیقات، اور علم ادب کی طرف خاص توجہ تھی۔ اندلس میں فلسفے کا ذوق عبدالرحمٰن ہی نے پیدا کیا تھا۔ اُس کے دربار کی شہرت نے دنیا بھر کے عالم، فاضل، شاعر، صناع جمع کر دئے

تھے عام لوگوں میں علم و ادب کا شوق پیدا کرنے کے لئے علمی بحثیں ہوتی تھیں اور مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے۔ اچھی نظموں اور اچھی تقریروں پر انعام دیا جاتا تھا۔ ان جلسوں کو اہم بنانے کے لئے وہ خود بھی شریک ہوتا تھا۔

اس نے دمشق کے نمونے کی ایک شان دار مسجد بھی بنائی تھی پر اُسے پورا کرنے سے پہلے ہی چل بسا اس کے خاندان میں اندلس کی حکومت بہت دنوں تک رہی اور یہ ملک اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا۔

مسلمانوں میں جب اپنے اوپر بھروسا تھا آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا حوصلہ تھا دوسروں میں علم۔ اخلاق اور تہذیب کی روشنی پھیلانے کی اُمنگ تھی صبر و استقلال تھا اور خطروں میں پڑنے کی ہمت تھی تو عبدالرحمٰن جیسے کتنے ہی لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے دنیا کو علم و اخلاق کی نعمت بخشی۔ اور جس ملک میں گئے وہاں کا زمین و آسمان بدل دیا پر یہ اگلے وقتوں کی باتیں ہیں۔

امام شافعیؒ

خدایا! قریش کو ہدایت کر یہیں اس خاندان کا عالم، روئے زمین کو علم سے مالا مال کردے۔ خدایا! جس طرح تونے ان پر عذاب نازل کیا ہے اسی طرح ان پر احسانات کی بھی بخشش فرما۔

(حدیث شریف)

محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن شافع خاندان قریش سے ہیں سلسلۂ نسب ہاشم بن عبد المطلب سے مل جاتا ہے ۱۵۰ھ میں شام میں بمقام غزہ پیدا ہوئے اور دو برس کے سن میں غزہ سے مکہ لائے گئے۔ اور یہیں ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ شروع میں میلان ادب کی طرف تھا اسی لئے مدتوں قبیلۂ ہذیل کے ساتھ رہے جو اس زمانے میں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے مشہور تھا پھر مکے میں آکر علمی و ادبی مشاغل میں منہمک ہو گئے ایک دن کسی نے ان سے کہا افسوس ہے کہ باوجود اس فصاحت اور ذکاوت کے فقہ کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ مسلمانوں کے سردار

بن جاتے امام صاحب نے دریافت کیا "فقہ کی تحصیل کے لئے کس کے پاس جانا چاہیئے" اس نے جواب دیا مسلمانوں کے سردار مالک بن انس کے پاس۔ یہ بات امام صاحب کے دل میں بیٹھ گئی۔ پہلے امام مالک کی کتاب موطا حفظ کی پھر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر شاگردی اختیار کی امام مالک ان کی فہم و فراست اور قوت حافظہ کے بہت معترف تھے۔ انھیں اپنے ہی پاس مہمان رکھا۔ امام شافعی جب ان سے رخصت ہونے لگے تو دور تک پہنچانے آئے اور بہت سے تحفے ساتھ کر دئے۔ امام صاحب نے دوسرے محدثین سے بھی حدیث پڑھی ہے اور اس سلسلے میں حجاز اور عراق کا کئی بار سفر کیا ہے۔

امام صاحب دولت مند نہ تھے یمن کے قاضی کی مدد سے انھیں ایک کام مل گیا اور عرصہ تک یہ کام کرتے رہے۔ آخر میں بغداد تشریف لے گئے وہاں بہت دنوں امام احمد بن حنبل کا ساتھ رہا یہاں سے وہ ۱۹۹ھ / ۸۱۴ء میں مصر تشریف لے گئے اور وہیں خلیفہ مامون عباسی کے عہد خلافت میں جمعرات کے دن رجب کی آخری تاریخ کو ۲۰۴ھ / ۸۱۹ء میں انتقال کیا۔ اور قرافہ میں دفن ہوئے جو ایک مشہور مقام ہے۔ آج کل اسی کے قریب خدیوی خاندان کا قبرستان ہے۔

امام صاحب حدیث کے حافظ تھے۔ اور علم فقہ میں مجتہد کا مرتبہ رکھتے تھے۔ امام ابو حنیفہ کے بعد مسلمانوں میں ان ہی کے ماننے والے

سب سے زیادہ ہیں۔ مصر اور عرب کے اکثر حصوں میں ان کا مذہب رواج پذیر ہے۔ ان کے علم فضل کا اعتراف خود ان کے استاد کرتے تھے۔ ان کے ایک استاد ابن عیینہ کے پاس کوئی فتویٰ یا سوال آتا تھا تو ان ہی کی طرف اشارہ کر دیتے تھے کہ شافعی سے پوچھو۔ اسی طرح ایک اور اُستاد نے بہت تھوڑی عمر میں فتوے کی اجازت دے دی تھی۔

ان کے شاگردوں میں بڑے پایہ کے لوگ پیدا ہوئے مگر امام احمد بن حنبل کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ امام احمد بن حنبل بھی امام صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے وہ جب چلتے تھے تو امام احمد بن حنبل ان کی سواری کے ساتھ رکاب تھام کر چلتے تھے ایک بار ایک صاحب نے ان کے بیٹے سے کہا تمھارے باپ کو کیا ہو گیا ہے کہ امام شافعی کی رکاب تھام کر چلتے ہیں امام حنبل نے یہ سنا تو کہا کہ ان سے کہ دنیا کہ اگر فقیہ بننا چاہتے ہیں تو ان کی دوسری رکاب تھامیں۔ امام حنبل ایک موقع پر فرماتے ہیں۔ محدثین میں کوئی ایسا نہیں جس پر امام شافعی کا احسان نہ ہو۔ مجھے حدیثوں میں ناسخ و منسوخ کا پتہ اسی وقت چلا جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور تعلیم حاصل کی۔

ایک بار ان کے بیٹے نے ان سے دریافت کیا ابّا! یہ امام شافعی کون بزرگ ہیں جن کے لئے روز آپ نمازوں میں دعا مانگتے ہیں انھوں نے کہا۔ بیٹا! امام شافعی دنیا کے لئے مثل سورج کے تھے جس طرح سورج کے احسان کا کوئی معاوضہ نہیں اسی

طرح ان کے احسانات کا بھی کوئی معاوضہ نہیں۔

ابو عبید کا قول ہے کہ امام شافعی سے زیادہ کامل انسان میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ ایک اور بزرگ کا قول ہے کہ ایک عرصہ تک امام شافعی کی خدمت میں رہا۔ میں نے علم فقہ، علم حدیث، فصاحت و بلاغت اور عقل و فہم میں ان سے کسی کو بہتر نہیں پایا۔ ہم نے سر عنوان جو حدیث نقل کی ہے اکثر علماء کا اتفاق ہے کہ اس کے مصداق امام صاحب ہیں۔

امام صاحب نے بہت سی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں کتاب الام، السنن، الماثورہ، اصول الفقہ، کتاب المبسوط، مسند الشافعی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں چھپ گئی ہیں اور بعض کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

امام صاحب کی زہد و عبادت کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ قرآن شریف بچپن ہی میں حفظ کر لیا تھا۔ رمضان کے زمانے میں بہت سے قرآن ختم کرتے تھے۔

ایک بار کسی شخص نے ان سے فتویٰ پوچھا، ان کے جواب پر اس نے کہا۔ آپ نے حضرت علی کی مخالفت کی ہے۔ ان کا قول یہ ہے ـــــ امام صاحب نے فرمایا میرے سامنے یہ ثابت کردو کہ واقعی یہ حضرت علی کا قول ہے تو میں اپنے رخسار زمین پر رگڑوں گا اور اقرار کروں گا کہ میرا قول غلط ہے۔

امام صاحب کی فقہ یعنی شافعی فقہ ماننے والے مصر میں اور مصر کے علاوہ عرب خصوصاً ساحلی مقامات میں زیادہ ہیں۔

احمد بن حنبلؒ

"اللہ نے ارتداد کے زمانے میں حضرت ابو بکرؓ کے ذریعے اسلام کی مدد کی اور اس وقت جب کہ اسلام سخت آزمائش میں مبتلا تھا اللہ نے اپنے اس بندے (احمد بن حنبل) کو مذہب کی حمایت کے لئے کھڑا کر دیا"

(علی مدینی)

امام ابو عبداللہ احمد بن محمد بن حنبل اپنے زمانے کے مشہور محدث، فقیہ اور مجتہد تھے اصل وطن مرو ہے۔ ان کے والد فوج میں ملازم تھے ان کے پیدا ہونے سے پہلے جوانی میں انتقال کیا۔ خاوند کے انتقال کے بعد ان کی والدہ بغداد چلی آئیں وہیں یہ پیدا ہوئے اور یہیں تربیت پائی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ علم حدیث کی طرف طبیعت کو زیادہ رغبت تھی۔ سولہ سال کی عمر میں حدیث پڑھنی شروع کی اُس زمانے کے بڑے بڑے محدثین کی شاگردی اختیار کی اور محض اس علم کی طلب میں

مکہ، مدینہ، شام، یمن، کوفہ، بصرہ غرض دور دور ملکوں کا سفر کیا۔

شروع ہی سے بہت سعادت مند نیک اطوار اور پرہیز گار تھے اس زمانے میں جن بیویوں کے مرد باہر کے سفر کو چلے جاتے تھے تو وہ خط وکتابت کے لئے ان ہی کو بلاتی تھیں۔ یہ گھروں میں اس طرح جاتے کہ نظریں زمین پر گڑی ہوتی تھیں کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ لوگ ان کی اس پاک بازی اور ادب و تمیز کو بہت پسند کرتے تھے۔

اپنے استادوں کا بہت احترام کرتے تھے، ان کے سامنے زبان نہیں کھولتے تھے، لوگ ان کی خاموشی پر اعتراض کرتے تو فرماتے کہ خدا نے ایک زبان اور دو کان اسی لئے دئے ہیں کہ سنو زیادہ اور بولو کم۔

حدیثیں حفظ کرنے میں اور علمی مشغولیتوں کے اعتبار سے وہ آپ اپنی مثال تھے۔ صحیح حدیثوں کے نقل کرنے میں بہت احتیاط اور کوشش سے کام لیتے تھے اس طرح انھوں نے بہت سی حدیثیں جمع کرلیں ان کے ساتھیوں اور ہم عصروں کو اس پر تعجب ہوتا تھا۔ امام صاحب اکثر فرمایا کرتے کہ میں برابر پڑھتا رہوں گا یہاں تک کہ میری عمر پڑھنے میں کٹ جائے اور میں قبر میں جا سوؤں۔ ان کا معمول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد مسجد کے منارہ سے لگ کر کھڑے ہو جاتے، لوگ چاروں طرف سے گھیر لیتے اور

حدیثیں پوچھتے امام صاحب حدیثیں زبانی سناتے چلے جاتے۔ آخر یہ علمی مجلس ختم نہ ہو پاتی کہ مغرب کی نماز کا وقت آجاتا۔ لوگوں پر ایسی محویت طاری ہوتی کہ اتنی دیر تک کھڑے رہتے مگر ذرا بھی تھکن معلوم نہ ہوتی۔

امام صاحب نے ایک مُسند (مجموعۂ احادیث) لکھی ہے (زمانہ تصنیف ۱۸۰ھ / ۷۹۶ء) اس میں ایک لاکھ بیس ہزار حدیثیں ہیں اس کتاب میں اُنھوں نے اکثر علوم و فنون جمع کر دیئے ہیں۔ امام صاحب خود اپنی اس مُسند کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں نے یہ مجموعہ سات لاکھ پچاس ہزار حدیثوں سے منتخب کیا ہے۔ مسلمانوں میں کسی حدیث کے متعلق اختلاف ہو تو اس کتاب سے سند لیتے ہیں اس میں نہ ہو تو حجت کے قابل نہیں۔

امام صاحب کے شاگردوں میں بڑے بڑے لوگ ہوئے ہیں ان میں امام بخاری، امام مسلم، امام بغوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خود امام صاحب، امام یوسف اور امام شافعی کے شاگرد ہیں۔ خصوصاً امام شافعی کا شروع سے ساتھ رہا ہے یہ ساتھ اس وقت چھوٹا ہے جب امام شافعی بغداد چھوڑ مصر تشریف لے گئے ہیں۔ امام صاحب فرماتے تھے میں نے بغداد میں جن لوگوں کو چھوڑا ہے امام حنبل ان میں سب سے زیادہ سمجھدار، متقی اور پرہیز گار ہیں۔

اس زمانے میں مسلمانوں کا رجحان فلسفے کی طرف زیادہ ہو چلا

تھا۔ یہاں تک کہ مذہب بھی اس کی زد میں آگیا تھا۔ بعض مسلمان عالموں نے فلسفے کی روشنی میں عقائد میں ایسی نئی نئی باتیں نکالی تھیں جو عام مذہبی عقیدوں کے خلاف تھیں۔ رفتہ رفتہ ایسے لوگوں کی ایک جماعت بن گئی تھی اور معتزلہ کے نام سے مشہور تھی، اس جماعت کے خیالات عام لوگوں میں بھی مقبولیت حاصل کر رہے تھے خود اس زمانے کا خلیفہ مامون بھی اس عقیدے سے متاثر تھا اور لوگوں کو زبردستی اس کے ماننے پر مجبور کرتا تھا۔ اس وقت امام احمد بن حنبل کا طوطی تمام عالم اسلامی میں بول رہا تھا ان کے ماننے والوں کا حلقہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ خلیفہ کو یقین تھا کہ اگر امام صاحب کو آمادہ کر لیا تو ان کے لاکھوں ماننے والے اس فرقے میں شریک ہو جائیں گے، چنانچہ اس نے اپنے علما کے ذریعے پہلے ان سے خط کتابت کی جب اس سے کام نہ چلا تو ہر طرح کا دباؤ ڈالا اور دھمکیاں دیں یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو قید کر دیا۔ امام صاحب کے ساتھ کچھ اور علما بھی قید تھے۔ ان میں سے بعض قتل کر دئے گئے بعض قید کی سختیوں سے مر گئے خود امام صاحب کو ہر وقت موت کا انتظار رہتا تھا اسی اثنا میں خلیفہ مامون کا انتقال ہو گیا اور معتصم اس کی جگہ خلیفہ ہوا۔ امام صاحب کوئی اٹھائیس مہینے تک جیل میں پڑے رہے آخر معتصم نے اپنے سامنے بلوا کر معتزلی عقیدے کے علما سے مناظرہ کرایا۔

مگر امام صاحب ہمیشہ سب پر غالب رہے۔ خلیفہ امام صاحب کی بے خوفی جرأت اور بہادری سے بہت متاثر تھا اور دل سے چاہتا تھا کہ کوئی سزا نہ دے مگر معتزلہ کے سردار نے اُسے بہت غیرت دلائی کہ اگر تم نے اسے چھوڑ دیا تو لوگ کہیں گے کہ خلیفہ پچھلے خلیفہ کے مذہب سے پھر گیا یہ سُن کر اُسے بھی جوش آ گیا اور جلّاد کو کوڑے مارنے کا حکم دے دیا کوڑوں کی مار سے امام صاحب بے ہوش ہو گئے تو اُنھیں پیروں سے روندا اور کچلا گیا مگر امام صاحب باوجود اس انتہائی سختی مصیبت اور تکلیف کے جس عقیدے کو حق سمجھتے تھے اسی پر قائم رہے آخر اس قدر ظلم و ستم کے بعد اُنھیں چھوڑ دیا گیا اور خود امام صاحب کی ایمانی جرأت اور استقلال کی بدولت اسلام اور مسلمانوں کو اس فتنے سے بڑی حد تک نجات مل گئی۔ اس واقعے کے بعد امام صاحب کی عزت و قدر مسلمانوں کے دل میں دوچند ہو گئی۔

امام صاحب ۲ ربیع الاول کو بیمار ہوئے اور نو دن مبتلا رہ کر ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ / ۸۵۵ء کو انتقال کیا۔ بیماری کے زمانے میں لوگوں کی بھیڑ رہتی تھی ایک بار خلیفہ نے عیادت کے لئے آنا چاہا مگر امام صاحب نے پسند نہ کیا۔ انتقال سے ایک یا دو روز پہلے بچوں کو بلایا اُنھیں پیار کیا سر پر ہاتھ پھیرا اور رو پڑے۔ انتقال کی خبر جس وقت مسلمانوں کو ملی تو ایک کہرام مچ گیا تمام گلیوں

اور سڑکوں پر لوگوں کا اژدحام تھا۔ کہتے ہیں جنازے میں ۸ لاکھ مردوں اور ساٹھ ہزار عورتوں نے شرکت کی۔

امام صاحب صرف محدث ہی نہ تھے بلکہ بہت بڑے فقیہ اور مجتہد بھی تھے آپ ان چاروں مشہور اماموں میں سے ایک ہیں جن کی پیروی کو ہم اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اس زمانے میں امام صاحب کی تقلید کرنے والے زیادہ تر بغداد اور اس کے اطراف میں تھے اور آج کل نجد کے عرب سب کے سب حنبلی ہیں۔

امام بخاری

محمد بن اسمٰعیل ابو عبد اللہ الجعفی ۱۳ر شوال ۱۹۴ھ (۲۱ر جولائی ۸۱۰ء) کو بخارا میں پیدا ہوئے ان کے والد اسمٰعیل بن ابراہیم بہت پرہیزگار علمار میں سے تھے۔ امام بخاری نے ذہن اور حافظہ بلا کا پایا تھا۔ بہت تھوڑی عمر میں لکھنا پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ دس سال کی عمر میں جب وہ مکتب میں پڑھتے تھے اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ حدیث کا علم پڑھنا چاہیئے یہ خیال آتے ہی نکل کھڑے ہوئے اور اپنے ہی وطن میں علمار حدیث سے حدیث پڑھنی شروع کر دی ایک سال کی محنت میں اتنی استعداد اور قابلیت پیدا ہو گئی کہ استادوں کی غلطیاں نکالنے لگے چنانچہ ایک مشہور استاد نے پڑھاتے وقت ایک شخص (راوی) کا نام غلط لیا امام صاحب نے ٹوکا۔ اُستاد کو بڑا غصہ آیا مگر انھوں نے عرض کیا کہ ذرا اصل دیکھیے اصل دیکھی گئی تو

معلوم ہوا کہ امام صاحب نے صحیح فرمایا تھا۔ اس وقت امام صاحب کی عمر ۱۱ سال تھی۔ سولہ سال کی عمر تک حدیث کی کئی کتابیں حفظ کر لیں اسی زمانے میں والدہ اور بھائیوں کے ساتھ حج کو گئے حج سے فراغت کے بعد یہ وہیں رہ گئے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ پھر اس علم کی تکمیل اور حدیثوں کی صحت و تحقیق کی جستجو میں مدینہ، بصرہ، شام، مصر، دمشق کا سفر کیا۔ ۱۱ سال تک مصر میں رہے اس کے بعد ۵ سال تک بصرے میں غرض سالہا سال ایشیا کے تمام علمی مرکزوں میں گھوم پھر کر اور اپنی تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آئے اور یہیں ۳۰ رمضان ۲۵۶ھ (۳۱ راگست ۸۷۰ء) میں انتقال کیا اور خرطانک میں دفن کئے گئے جو سمرقند سے بہت قریب ایک جگہ ہے۔

امام صاحب کے چند ساتھیوں کا بیان ہے کہ ان کے ساتھ ہم بھی حدیث پڑھنے جاتے تھے، ہم سب حدیثیں نقل کر لیا کرتے تھے مگر امام صاحب باوجود اصرار کے کبھی نہیں لکھتے تھے۔ ایک دن فرمانے لگے "تم بار بار مجھے پریشان کرتے ہو بتاؤ تو کتنی حدیثیں لکھ چکے ہو"۔ ہم نے اپنی اپنی کاپیاں دکھائیں ۱۵ ہزار سے زیادہ حدیثیں لکھی ہوئی تھیں مگر امام بخاری کو یہ تمام حدیثیں حفظ یاد تھیں اور اس قدر صحت کے ساتھ یاد تھیں کہ ہم نے ان سے پوچھ پوچھ کر کئی جگہ اپنی غلطیاں درست کیں۔

ایک صاحب امام بخاری کے ایک استاد کے پاس گئے انھوں نے کہا تم دیر میں آئے ورنہ میں تمھیں ایسا لڑکا دکھاتا جسے ستر ہزار حدیثیں یاد ہیں۔ یہ صاحب امام صاحب کی تلاش میں نکلے اور ملاقات ہوئی تو بڑے تعجب سے حقیقت دریافت کرنے لگے۔ امام صاحب نے کہا مجھے اس سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں اور جن صحابہ اور تابعین سے حدیث بیان کروں گا اُن میں سے اکثر کی ولدیت، سکونت اور تاریخ وفات کا مجھے علم ہوگا۔ خود امام صاحب کا بیان ہے کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں۔

ایک بار امام بخاری بغداد میں تشریف لائے تو وہاں کے علمار نے آپ کا امتحان لینا چاہا۔ سو حدیثیں انتخاب کی گئیں اور اُنھیں ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیا گیا۔ کسی سند اور کسی کی عبارت میں تبدیلی کر دی گئی۔ دوسرے دن مجلس میں یہ حدیثیں پیش کی گئیں امام صاحب ہر حدیث کے جواب میں فرماتے جاتے تھے کہ "مجھے نہیں معلوم" جب سو کی سو حدیثیں پوری ہو گئیں تو امام صاحب نے اس طرف توجہ فرمائی ہر ایک حدیث میں جو غلطیاں تھیں وہ بتائیں اور انھیں درستی و صحت کے ساتھ پڑھا۔ لوگ حیرت میں رہ گئے اور اس عجیب و غریب قوت حافظہ کا لوہا مان گئے۔

طالب علمی کے زمانے میں مختلف ملکوں کا سفر کچھ کم مصیبت نہ تھی پھر کبھی کبھی اس غریب الوطنی کی حالت میں مالی پریشانیوں سے اس مصیبت اور تکلیف میں اور بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔ ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ ہم امام صاحب کے ساتھ بصرے میں رہتے تھے ایک بار وہ غائب ہو گئے ہم نے تلاش کیا تو ایک مکان میں سے ملے مفلسی کا یہ حال تھا کہ بدن پر کپڑے کا ایک تار تک نہ تھا۔

ایک بار امام صاحب کا خرچ ختم ہو گیا اور خرچ کے ساتھ کھانے پینے کا سارا سامان بھی مگر انھوں نے کسی کو خبر نہ کی اور تین چار دن تک جنگل کی گھاس اور جڑی بوٹیاں کھاتے رہے آخر ایک دن کوئی نامعلوم شخص اشرفیوں کی ایک تھیلی یہ کہہ کر دے گیا کہ اس کو اپنے اوپر خرچ کیجئے۔

ایک شخص پر امام صاحب کا پچیس ہزار درہم قرض تھا یہ بہت مال دار آدمی تھا لیکن قرض ادا کرنے میں ہمیشہ لیت ولعل کرتا تھا لوگ برابر امام صاحب کو مجبور کرتے تھے کہ روپیہ وصول کیا جائے مگر امام صاحب ہمیشہ ڈھیل دیتے تھے۔ آخر لوگوں نے وہاں کے والی کو اطلاع کر دی اس نے مقروض پر سختی شروع کی امام صاحب نے سنا تو بہت ناراض ہوئے اور والی کو منع کر بھیجا کہ اس پر کوئی سختی نہ کی جائے اور اس سے اس بات پر معاملہ کر لیا کہ دس درہم سالانہ دیا کرے۔ یہ دس درہم بھی اس سے

وصول نہ ہو پائے۔

ایک بار امام صاحب کے پاس کچھ تجارتی سامان تھا چند تاجروں نے اُن سے ۱۵ ہزار کے نفع سے خریدنا چاہا مگر کسی وجہ سے معاملہ ملتوی ہو گیا دوسرے دن دوسرے تاجر آئے اور ۱۵ کے بجائے ۲۵ ہزار منافع دینا چاہا مگر امام صاحب نے فرمایا میں اُنھیں کے ہاتھ بیچنے کی نیت کر چکا ہوں جو کل آئے تھے۔

امام صاحب بڑے زاہد متقی اور پرہیزگار تھے رمضان کے مہینہ میں تراویح خود ہی پڑھاتے تھے اور مہینہ بھر میں قرآن ختم کر دیتے تھے علاوہ اس کے خود ہر تیسری رات کو قرآن ختم کرتے تھے۔

ایک دفعہ بھڑ نے سات دفعہ نماز پڑھتے میں کاٹا مگر امام صاحب نے نیت نہیں توڑی اور نہ چہرے پر کوئی اثر ظاہر ہوا۔

امام صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مجلس میں ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ کاش آپ احادیث کی ایک مختصر سی کتاب مرتب کر لیتے یہ بات میرے دل میں اُتر گئی اور میں نے اس اہم کام کو انجام دینے کا تہیہ کر لیا۔ میں نے اس کتاب کی حدیثیں ۶ لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کیں اور ۱۶ سال میں یہ کام ختم ہوا۔ بہت سی حدیثیں طویل ہونے کی وجہ سے چھوڑ دی گئی ہیں۔ میں نے تین بار اس کو ترتیب دیا ہے۔

اپنی اس تصنیف میں امام صاحب نے فقہ کے طرز پر باب قائم کئے ہیں انھوں نے اس سلسلے میں ایک مکمل اسکیم بنائی تھی لیکن تمام ابواب کے لئے انھیں حدیثیں جمع کرنے میں کامیابی نہ ہوئی. حدیثوں کے انتخاب میں انھوں نے غیر معمولی نقادانہ قابلیت کا ثبوت دیا ہے اپنی کتاب کی ترتیب کے وقت انھوں نے احادیث کی صحت کے لئے زیادہ سے زیادہ تلاش وجستجو کی ہے پھر بھی اُنھوں نے اپنے مواد کے متعلق جا بجا مختصر نوٹ لکھے ہیں جو کتاب کے اصل متن سے بالکل الگ ہیں۔

امام صاحب کی غیر معمول شخصیت کے لوگ پہلے ہی سے معترف تھے جامع صحیح کی تصنیف نے ان کی عزت و وقعت میں چار چاند لگا دئے لوگوں کو امام صاحب سے بڑی عقیدت ہوگئی۔ ایک دفعہ امام مسلم جو خود ایک مشہور محدث ہیں امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے دونوں آنکھوں کو چوما اور جوش عقیدت میں کہنے لگے" اے استادوں کے استاد! مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کے قدم چوموں "

ابوداؤد ظاہری

سلیمان داؤد بن علی بن خلف الاصفہانی ان کے باپ دادا کا وطن اصفہان ہے مگر یہ خود ۲۰۲ھ ۸۱۷ء میں کوفے میں پیدا ہوئے اور بغداد میں تعلیم و تربیت حاصل کی اس زمانے میں علم حدیث اور فقہ کا چرچا تھا انھوں نے بھی وقت کے بڑے بڑے محدثین اور فقہا (ماہرین علم فقہ) سے یہ دونوں علم سیکھے اور مہارت حاصل کی یہ امام شافعی کے بہت مداح تھے اُن پر دو کتابیں بھی لکھیں مگر تقلید کسی کی نہیں کی بلکہ خود مجتہد تھے اور فقہ کے مسئلوں میں قرآن و حدیث کو اپنے سامنے رکھتے تھے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا ان کے (قرآن و حدیث کے) ظاہری معنیٰ پر عمل کرتے تھے دوسرے اماموں کی طرح اپنی رائے کو دخل نہیں دیتے تھے اسی لئے داؤد ظاہری کے نام سے مشہور ہوئے۔ چاروں اماموں کی طرح یہ بھی ایک مستقل مذہب کے امام تھے۔ ان کی فقہ

کے ماننے والے ان کی زندگی ہی میں بے شمار پیدا ہو گئے تھے اور ظاہری کہلاتے تھے مگر بعد میں ان کی فقہ چاروں اماموں کی فقہ کے مقابلے میں زیادہ مقبول نہیں ہوئی۔ امام صاحب نے ۲۷۰ھ / ۸۸۳ء میں بغداد میں انتقال کیا۔ ایک بہت بڑے عالم کا قول ہے کہ امام صاحب کے انتقال سے بغداد کی علمی سرداری کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک دوسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ امام صاحب بہت بڑے محدث تھے حدیث کی خوب پرکھ تھی اور جانتے تھے کہ کون سی حدیث کھوٹی ہے اور کون سی کھری۔ ان کی خدمت میں چار سو عالم حاضر رہتے تھے۔ اور فقہ اور حدیث کا علم سیکھتے تھے۔

امام صاحب بہت متقی اور پرہیزگار تھے۔ حدیث اور فقہ کی خدمت کے علاوہ اکثر وقت عبادت اور ریاضت میں گذرتا تھا۔ غریبی اور مفلسی کی زندگی سے انھیں بھی دوچار ہونا پڑا مگر خودداری کا یہ حال تھا کہ کسی کی مدد گوارا نہ تھی۔ اس زمانے کے ایک قاضی صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار میں عید کی نماز پڑھ کر مبارکباد دینے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اندر داخل ہوا تو اُن کے سامنے ایک طباق رکھا تھا اس میں ابلی ہوئی سبزی اور آٹے کی بھوسی تھی مجھے بہت رنج ہوا اور یہاں سے نکل کر میں سیدھا وہاں کے ایک رئیس کے یہاں گیا جو بہت سخی اور فیاض مشہور تھا۔ اس نے میری بڑی آؤ بھگت

کی میں نے کہا "تم اتنے دولت مند اور فیاض ہو مگر امام صاحب کے حالات سے بالکل بے خبر ہو۔ تمھیں معلوم نہیں وہ مسلمانوں کے کتنے بڑے عالم ہیں۔ اس نے کہا "جناب میں کیا کروں کل ہی میں نے ایک ہزار درہم ان کی خدمت میں بھیجے تھے انھوں نے فوراً واپس کردئے اور غلام کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے اور تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں ضرورت مند ہوں مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا اور اس سے کہا کہ تھیلی مجھے دو میں خود جاکر دے آتا ہوں اس نے ایک کی جگہ ایک ایک ہزار درہم کی دو تھیلیاں دیں۔

میں پھر تھیلیاں لے کر امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا مگر انھوں نے فرمایا شاید یہ اس بات کی سزا ہے کہ میں نے تمھیں اپنا رازدار بنایا تھا میرے اوپر رحم کیجئے اور اس سوغات کو فوراً واپس لے جائیے" امام صاحب کی اس خودداری صبر، قناعت اور توکل کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور دنیا میری نظروں میں ہیچ نظر آنے لگی۔ سچ ہے قومیں ایسے ہی بے نفس بے نیاز اور خوددار بزرگوں کی بدولت ترقی کرتی ہیں اسلام نے ان ہی بزرگوں کی بدولت دنیا میں علم اور اخلاق کی روشنی پھیلائی۔

طبری

علامہ طبری رح ۲۲۴ھ ۸۳۸ء میں آمل (علاقہ طبرستان) میں پیدا ہوئے اور شوال ۳۱۰ھ ۹۲۲ء میں انتقال کیا۔ جب کچھ بڑے ہوئے تو علم کی جستجو میں بغداد، شام، مصر اور عراق کا سفر کیا۔ اس زمانے کے بڑے بڑے محدثین سے حدیث پڑھی پھر امام مالک، امام شافعی اور اہل عراق (ابو حنیفہ) کی فقہ میں مہارت حاصل کی۔ علم قرآن (تفسیر) نحو، شعر، لغت اور فقہ، غرض تمام علوم پر گہری نظر تھی اکثر علوم وفنون پر کتابیں لکھی ہیں۔

مستقل مزاجی ان کی طبیعت کا خاص وصف تھا۔ جو کام کرتے تھے تیا مار کر کرتے تھے۔ کسی چیز کے بارے میں ہمیشہ سوچ سمجھ کر رائے قائم کرتے تھے۔ اسی لئے ان کی رائیں اکثر صحیح ہوتی تھیں خوش بیانی میں بھی خاصی شہرت حاصل کی۔ کہتے ہیں چالیس برس تک روزانہ چالیس صفحے لکھتے رہے یہ بیان مبالغہ سے خالی نہیں مگر اس سے

یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے علمی کاموں میں انھیں کس درجہ شغف اور انہماک تھا۔ ان کی دونوں کتابیں تاریخ اور تفسیر جن کی وجہ سے اُنھیں اتنی شہرت ہوئی تیس ۳۰ تیس ۳۰ ہزار صفحوں کی تھیں۔ شاگردوں نے اُن سے اختصار کی درخواست کی تب جا کر وہ اس صورت میں مرتب ہوئیں۔

جس زمانہ میں تفسیر کبیر شائع ہوئی ہے تفسیر کے علم نے بہت ترقی کر لی تھی اس تفسیر کا نام جامع البیان فی تفسیر القرآن ہے۔ مؤلف نے اس میں صحابہ اور تابعین کے اقوال جمع کر دئے ہیں یہ سب سے پہلی اور بہت بڑی تفسیر ہے اسی لئے اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اکثر فقہا اور محدثین کا قول ہے کہ اسلام میں اس سے بہتر تفسیر نہیں لکھی گئی۔ تفسیر کے علاوہ اس میں تاریخی، لغوی اور ادبی فائدے بھی ہیں۔

تفسیر کبیر انھوں نے اپنی تاریخ سے پہلے لکھی ہے یہ دونوں کتابیں اہل علم کے لئے بہت فائدہ کا موجب ہیں۔ ہر شخص ان کی طرف رجوع کرتا ہے۔ کسی چیز کی نقل کرتے وقت وہ بہت احتیاط اور دیانت سے کام لیتے تھے اسی لئے ان کی تاریخ صحیح ترین تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ ادب، شعر اور زبان سے متعلق بہت سی کتابیں لوگوں نے خود ان کے ہاتھ کی لکھی دیکھی ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے اور بہت سے شعراء ان کی

طرف منسوب ہیں۔ فقہ کے مسئلوں میں وہ کسی امام کی پیروی نہیں کرتے تھے بلکہ خود اجتہاد کرتے تھے۔ شیخ ابو اسحٰق شیرازی نے ان کا نام مجتہدین کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

وہ بہت ثقہ قابل اعتماد اور وسیع العلم تھے اسی لئے ان کے قول کو لوگ قطعی فیصلے کی وقعت دیتے تھے اور ان کی رائے پر چلتے تھے۔ بہت حق پسند تھے۔ جس بات کو حق سمجھتے تھے کھلم کھلا ظاہر کرتے تھے۔ اس لئے بہت سے لوگ اُن کے مخالف ہو گئے۔ مگر اُنھوں نے کبھی اس کی پروا نہ کی۔ وہ اپنے باپ کے گاؤں میں زہد اور قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

جب انتقال ہوا تو دن کے وقت اسی مخالفت کے سبب لوگوں نے ان کی تجہیز و تکفین میں مزاحمت کی اسی لئے رات کو اپنے گھر میں دفن کئے گئے۔

کتاب الفہرست میں مصنف نے ان کی بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر ضائع ہو گئیں صرف چار پانچ کتابوں کے (مکمل اور نامکمل) نسخے مختلف مقامات میں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض یورپ اور دوسرے مقامات میں چھپ بھی گئے ہیں۔

جعفر برمکی

عباسی سلطنت کو عروج و استقلال اہل عجم ہی کی بدولت نصیب ہوا اس لئے عباسیوں کے دربار میں ہمیشہ عجمی برسرِ اقتدار رہے ان کے شروع میں عجمی خاندانوں میں برامکہ نے اپنے علم و فضل تدبر و سیاست دانی حسن اخلاق اور فیاضی و سیر چشمی کی وجہ سے غیر معمولی عروج حاصل کیا۔ ویسے تو ان میں ہر ایک علم و عقل میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھا مگر جعفر برمکی ہر اعتبار سے ان سے افضل تھا۔

پیدا ہونے کی تاریخ صحیح طور پر معلوم نہیں قیاساً ۱۵۱ھ تخمینہ کیا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں بھی کچھ زیادہ نہیں معلوم۔ اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے مفتی اعظم امام ابو یوسف سے فقہ پڑھی تھی بہرحال تعلیم سے فارغ ہوا تو خلیفہ ہارون رشید اُس سے مختلف کام لینے لگا۔ اس کی غیر معمولی قابلیت اہلیت

معاملہ فہمی اور تدبر سے خلیفہ دن پر دن متاثر ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ ایک دن اُس کے حقیقی بھائی فضل بن سہل کو اس منصب سے علیحدہ کر کے جعفر کو وزیر اعظم بنا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُسے اپنے لڑکے مامون کا اتالیق مقرر کیا آہستہ آہستہ خلیفہ ہارون الرشید اور جعفر کے تعلقات اس قدر بڑھے کہ دونوں بھائی بھائی معلوم ہوتے تھے۔ اکثر دونوں ایک ساتھ رہتے تھے۔ خلیفہ کو اپنے وزیر پر پورا اعتماد تھا اور جعفر بھی پوری محنت اور دل سوزی سے کام کرتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ملک میں ہر طرف خوش حالی اور امن و امان کا دور دورہ تھا۔

لیکن کچھ ایسی صورتیں پیدا ہوئیں کہ برامکہ کے اقبال کا سورج گہنانے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ جعفر، فضل اور ان دونوں کے باپ یحییٰ برمکی کی جو حیثیت تھی حکومت کے کسی اور رکن کی نہ تھی، خلیفہ نے سارا کام اُن ہی پر چھوڑ رکھا تھا۔ لیکن ہارون کے اس اعتماد سے اُنھوں نے ناجائز فائدہ اُٹھانا شروع کیا۔ ایک طرف تو خلیفہ کے اختیارات میں فرق آنے لگا۔ دوسرے عام لوگوں کا میلان بہ نسبت خلیفہ کے ان لوگوں کی طرف بڑھنے لگا۔ آخر خلیفہ نے مجبور ہو کر جعفر کو قتل[۵] اور اُس کے پورے خاندان کو برباد کر دیا۔ خود خلیفہ کو جعفر کے قتل اور اُس کے خاندان کی تباہی کا افسوس تھا لیکن اگر وہ

---

[۵] یہ حادثہ ۱۸۷ھ / ۸۰۲ء میں پیش آیا۔

ایسا نہ کرتا تو خود اُس کی سلطنت خطرے میں تھی۔

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ جعفر کا سارا خاندان خوبیوں کا مجموعہ تھا لیکن جعفر ان سب میں ممتاز تھا اُس کی علمی قابلیت کا سب سے بڑا ثبوت تو خلیفہ مامون الرشید کی ذات ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت ہارون الرشید نے جعفر ہی کے سپرد کی تھی۔ ملکی انتظامات کے بعد جو کچھ وقت بچتا تھا وہ علمی مشغلوں میں صرف کرتا تھا۔ شاعری، فلسفہ اور نجوم سے اُسے خاص طور سے دلچسپی تھی۔ انشا پردازی کا ماہر تھا۔ احکام فرمان اور دوسری سلطنتوں کے معاہدے اپنے قلم سے لکھتا تھا۔ محض ادبی خوبیوں کی وجہ سے اُس کے معمولی فرامین اشرفیوں کے مول بکتے تھے۔ سلطنت کا انتظام قابلِ رشک تھا ہر طرف امن و امان۔ رعایا خوش حال اور ملک سرسبز و شاداب۔ شرعی معاملات کے بارے میں اُس کے فیصلے ہمیشہ قرآن و حدیث کے مطابق ہوتے تھے۔ برامکہ کی سخاوت اور خوش اخلاقی مشہور ہے۔ جعفر بھی بہت خوش اخلاق غریب پرور اور سخی تھا۔ اُس کی سخاوت کے بے شمار قصے مشہور ہیں جنھیں سن کر حیرت ہوتی ہے۔ کسی ضرورت مند کو ہزاروں روپئے دے ڈالنا اُس کے لئے معمولی بات تھی بہت سے غریب و مسکین اُس کی فیاضی کی بدولت امیر بن گئے۔

اس کا قول ہے۔ کسی شخص کی حاجت پوری کرنے میں توقف

ہو جائے تو اُس سے معذرت کرنا چاہیے کیوں کہ حاجت مند مجبوری کی حالت میں مانگتا ہے. علمار اور شعرا کی قدر دانی میں بھی مشہور تھا بہت سے شاعر ادیب اور عالم اُس کے ممنون احسان تھے.

جاحظ

ابو عثمان عمر بن بحر بن محبوب تقریباً ۱۵۹ھ / ۷۷۵ء کو بصرہ میں پیدا ہوا اس کا دادا بہت سیاہ فام تھا اور بصرے میں اونٹ چراتا تھا۔ پوتا اس سے بھی زیادہ بدصورت تھا۔ قد بہت چھوٹا رنگ جیسے کسی نے چہرہ پر کالک مل دی ہو آنکھیں پھٹی پھٹی دیدے باہر کو نکلے ہوئے ان سب چیزوں نے مل کر ایسی ہیئت بنا دی تھی کہ دیکھ کر دل میں نفرت پیدا ہوتی تھی اسی لئے اس کا نام جاحظ پڑ گیا۔ ایک دفعہ عباسی خلیفہ متوکل نے اسے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کرنا چاہا لیکن صورت دیکھ کر نفرت پیدا ہوگئی اور دس ہزار درہم دے کر واپس کر دیا۔

جاحظ اپنی بدصورتی کا حال خود جگہ جگہ مذاق کے پیرائے میں بیان کرتا ہے دو تین دفعہ محض بدصورتی کی بنار پر اُسے سخت شرمندگی بھی اُٹھانی پڑی۔ ایک واقعہ خود اُس کی زبانی سنئے۔

"میں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا کہ ایک عورت آئی اور کہنے لگی مجھے آپ سے کچھ کام ہے ذرا تھوڑی دور تک میرے ساتھ چلئے" میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وہ مجھے ایک سنار کے پاس لے گئی اور اس سے بولی "بس بالکل ان جیسا" یہ کہہ کر وہ اُلٹے پاؤں واپس ہو گئی۔ میں نے سنار سے پوچھا "کیا قصہ ہے" اس نے جواب دیا "یہ میرے پاس انگوٹھی لائی تھی اور کہتی تھی کہ" اس پر شیطان کی صورت نقش کر دو" میں نے کہا بڑی بی میں نے شیطان کہاں دیکھا" تو بس وہ آپ کو لے آئی" میں یہ سن کر شرم سے پانی پانی ہو گیا"

جاحظ بچپن سے بہت ذہین تھا، حافظہ بلا کا پایا تھا اس کے ساتھ پڑھنے لکھنے کا شوق بھی تھا شروع ہی سے بصرے کے عالموں اور ادیبوں کی صحبت میں بیٹھتا اور ان سے علمی فیض حاصل کرتا تھا۔ تھوڑے دنوں میں اس نے بہت اچھی استعداد پیدا کر لی۔ مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ کتب فروشوں سے کتابیں کرائے پر لے کر رات رات بھر مطالعہ میں گزار دیتا تھا۔

بصرے میں عرصے تک علم حاصل کرنے کے بعد وہ بغداد گیا اور یہاں کے مشہور عالموں سے مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی ان ہی استادوں میں ایک مشہور معتزلی نظام بھی تھے جاحظ نے بھی نظام کی صحبت میں یہی عقیدہ قبول کر لیا۔

جاحظ نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں تجارت بھی شروع کی تھی۔ لوگوں نے اُسے بصرے کی نہر پر مچھلی اور روٹی بیچتے دیکھا ہے شاید علم کے شوق نے یہ کام اس سے چھڑا دیا ہو۔ بہر حال بغداد میں جب وہ پڑھ لکھ کر فارغ ہوا تو تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کی شروع میں لوگوں نے اس کی کتابوں کی بہت مخالفت کی اور سخت تنقیدیں لکھیں جاحظ کو اس کا بہت رنج ہوا۔ یہ انسان کی کچھ فطرت سی ہو گئی ہے کہ وہ اپنے عہد کے لوگوں کے مقابلہ میں اگلے لوگوں اور اُن کے کارناموں کی زیادہ قدر کرتا ہے۔

جاحظ اس بات کو خوب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس وقت اُس نے جو کتابیں لکھیں وہ ابن مقفع یا پچھلے زمانے کے دوسرے مشہور مصنفوں کی طرف منسوب کر دیں۔ یہ کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ مگر بعد کے لوگوں نے خود اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اپنی لکھی ہوئی کتابیں اُس کی طرف منسوب کر دیں جس سے اُس کے حالات لکھنے والوں کو بہت دقتیں پیش آئیں۔

جاحظ کی شہرت خلیفہ مامون عباسی کے کانوں تک پہنچی تو اپنے دربار میں بلایا اور ایک محکمے کا صدر بنا دیا۔ لیکن ایسی کچھ صورتیں پیش آئیں کہ جاحظ نے تیسرے ہی دن استعفیٰ دے دیا۔

۲۲۱۰۲۰ھ / ۸۳۵ء میں خلیفہ معتصم نے ابن زیات کو اپنا وزیر بنایا یہ اپنے زمانے کا بہت بڑا ادیب اور جاحظ کا دوست تھا۔ اس لئے

بجاحظ کا نصیب بھی چمک اُٹھا اور اُس نے یہ زمانہ بہت بے فکری اور عیش و آرام میں گذارا۔ لیکن بغداد میں ایک شخص ابن زیات کا سخت دشمن تھا اور ہمیشہ اس کی فکر میں رہتا تھا۔ جب متوکل خلیفہ ہوا تو اُسے موقع ملا اور ابن زیات کو گرفتار کرکے تنور میں ڈلوایا۔ اب جاحظ کو اپنی فکر پڑی کہ کہیں میرا بھی یہی حشر نہ ہو۔ اور چھپ گیا۔ مگر قاضی ابودُواد کے آدمیوں نے اُسے گرفتار کرلیا اور ہتھکڑی بیڑی ڈالے اُسے قاضی کے پاس لائے۔ لیکن جاحظ اپنی شیریں زبانی اور بذلہ سنجی کی بدولت بچ گیا۔ آخر قاضی ابو دواد نے اس کا قصور معاف کرادیا اور اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا۔ ایک سال تک وہ اس کے پاس رہا۔ قاضی ابو دواد فالج کے مرض میں مبتلا ہوگیا تو اس کا بیٹا اس کا جانشین ہوا اور جاحظ اس کی خدمت میں رہا۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ان کے اقبال کا ستارہ بھی غروب ہوگیا۔ اب جاحظ بھی بہت بوڑھا اور کمزور ہوگیا تھا۔ پھر فالج کے اچانک حملے نے اسے اور بھی کمزور کردیا تھا اس لئے اسے مجبوراً بغداد چھوڑ کر اپنے وطن واپس آنا پڑا اور عرصے تک بیمار رہنے کے بعد یہیں اُس نے انتقال کیا۔

بیماری کے زمانہ میں بڑے بڑے ادیب دور دور ملکوں سے اس کی زیارت کو آتے تھے اور جاحظ ان کا بہت فراخ دلی اور مسرت سے خیر مقدم کرتا تھا۔ وہ فطرۃً بہت زندہ دل اور نکتہ سنج تھا

مرض کی حالت میں بھی اُس کی زندہ دلی میں کمی نہ آئی۔ لوگ مشتاق رہتے تھے کہ ہم اُس کے منہ سے کوئی بات سنیں اور بعد میں دوسروں کے سامنے بیان کریں۔

جاحظ کو روپئے سے بہت محبت تھی ایک شخص نے اس کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس سے جاحظ کی ذہانت اور روپیہ کی محبت کا پتہ چلتا ہے وہ کہتا ہے۔ میں سندھ گیا تھا۔ وہاں میں نے بہت دولت کمائی واپس آنے لگا تو تیس ہزار دینار پاس تھے۔ میں نے چنگی کے خوف سے دس ہزار ہلیلوں میں یہ اشرفیاں چھپا دیں بصرے پہنچ کر معلوم ہوا کہ جاحظ فالج کے مرض میں مبتلا ہے۔ مجھ بھی شوق ہوا کہ انتقال سے قبل اس کی زیارت کرلوں۔ بڑے اصرار کے بعد اس نے اپنے پاس آنے کی اجازت دی۔ میرا پتہ اور نام ونسب پوچھا جب معلوم ہوا کہ برامکہ کے خاندان سے ہوں تو بڑی دعائیں دیں آخر میں سلام کرکے رخصت ہوا دہلیز تک پہنچا ہوں گا کہ اس نے پوچھا۔ تمھیں معلوم ہے فالج میں ہلیلہ بھی فائدہ کرتا ہے؟ میں نے کہا "جی نہیں" اس پر کہنے لگا "تمھارے پاس جو ہلیلہ ہے وہ مجھے نفع کرے گا اُس میں سے کچھ بھیج دینا"۔ مجھے حیرت تھی کہ باوجود اس قدر چھپانے کے اسے کیسے خبر ہوگئی آخر میں نے سو ہلیلے (تین سو دینار) بھیج دیے۔

جاحظ نے بہت معمولی حالت سے ترقی کی تھی پھر اپنی زندگی

میں عیش و آرام بھی اُٹھایا۔ طرح طرح کی مصیبتیں بھی برداشت کیں فالج کے مرض میں مدتوں تک ایڑیاں رگڑتا رہا۔ مگر ایک چیز جو اس کی طبیعت کا اصلی جوہر تھی وہ ہمیشہ اس میں باقی رہی یعنی زندہ دلی اور ظرافت۔ یہ چیز اس کی گفتگو ہی میں نہیں، تحریر میں بھی نمایاں ہے

اس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور سب کی سب اپنے فن میں اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ عربی ادب میں اس کا ایک خاص درجہ ہے اس کے مرنے کے بعد اس کے ماننے والے بہت سے پیدا ہو گئے اور ایک خاص فرقہ جاحظیہ اسی کے نام سے مشہور ہوا۔ بہت سے لوگوں نے اپنی تصنیفیں اس کی طرف منسوب کر دیں اور وہ خوب مقبول ہوئیں۔

اس کی بہت سی کتابیں یورپ اور مصر میں چھپ چکی ہیں۔

خلیفہ مامون عباسی

عبداللہ بن ہارون الرشید عرف مامون الرشید، عباسی خاندان کا بہت زبردست اور مشہور خلیفہ گزرا ہے۔ ترتیب کے اعتبار سے یہ اپنے خاندان میں چھٹا خلیفہ تھا مگر شہرت اور کامیابی کے لحاظ سے اس کا مرتبہ سب میں بلند ہے۔

۱۷۰ھ میں پیدا ہوا۔ پیدائش کی رات اس کے چچا ہادی نے انتقال کیا اور اس کا باپ ہارون الرشید ہادی کی جگہ خلیفہ ہوا۔

پانچ برس کا ہوا تو اس زمانے کے بڑے بڑے اور مشہور عالم کسائی اور یزیدی وغیرہ اس کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کئے گئے۔ پانچ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ مگر ابھی سے تیزی ذہانت عقلمندی اور سوجھ بوجھ اُس کی ہر بات سے ٹپکتی تھی۔ کسائی کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ مامون کو پڑھنے کا حکم دیتا اور خود سر جھکائے چپکا بیٹھا رہتا۔ مامون کہیں غلطی کرتا تو فوراً اس کی نگاہ اُٹھ جاتی۔ بس

اس ذرا سے اشارے سے مامون فوراً اپنی غلطی معلوم کر لیتا۔ اور عبارت صحیح کر لیتا ادب اور سعادت مندی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ کسائی نے کسی بات پر اُسے سزا دی وہ رو رہا تھا کہ اتنے میں وزیر جعفر برمکی اس سے ملنے آ گیا اور دیر تک اُس سے باتیں کرتا رہا۔ کسائی نے پوچھا کہ کہیں تم نے میری شکایت تو نہیں کر دی۔ مامون نے بڑے ادب سے جواب دیا جعفر کی تو کیا حقیقت، میں ہارون الرشید سے تو کہنے کا نہیں کیا میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کے پڑھانے لکھانے اور تربیت سے مجھے کس قدر فائدہ پہنچے گا"

مامون جب ذرا بڑا ہوا تو مشہور وزیر جعفر برمکی کے سپرد کر دیا گیا اور کچھ تو اپنی ذہانت اور کچھ ایسے ایسے مشہور عالموں کی تربیت کی بدولت جوان ہو کر ہارون کی اولاد میں سب سے لائق نکلا۔

مامون کے علاوہ خلیفہ ہارون کے اور کئی اولادیں تھیں۔ ان میں امین الرشید کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ یہ خلیفہ کی خاص بیگم۔ زبیدہ خاتون کا لڑکا تھا۔ یہ بھی بڑا ذہین اور سمجھ دار تھا مگر اس کا اور مامون کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ کئی بار خلیفہ ہارون نے ان دونوں کی تیزی اور ذہانت کا امتحان لیا اور ہمیشہ مامون ہی بازی لے گیا۔ اسی وجہ سے ہارون اپنے بعد مامون کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا مگر زبیدہ خاتون اور دربار کے کچھ لوگوں کے دباؤ سے اُس نے امین کو اپنا ولی عہد بنایا پھر بھی یہ شرط لگا دی کہ امین کے بعد مامون خلیفہ ہو۔ اس طرح

اس وقت تو یہ چیز گویا طے ہو گئی مگر ہارون کے مرنے کے کچھ عرصہ بعد لڑائی جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور دونوں میں خلافت کے لئے با قاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ اس لڑائی کا نتیجہ امین کے قتل اور مامون کی کامیابی کی صورت میں نکلا۔ شروع شروع میں کچھ لوگوں نے اس سے بغاوت کی مگر وہ جلد ان بغاوتوں پر غالب آ گیا۔ اور نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ حکومت کے انتظام میں مشغول ہو گیا اس کی حکومت کا زمانہ ہر قسم کی ترقیوں کے اعتبار سے عباسی خلفاء میں سب سے بہتر زمانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

صحابۂ کرام اور پھر بنو امیہ کے خاندان کے خلفاؔ نے بے شمار ملک فتح کئے عباسی خاندان کے خلیفہ اس اعتبار سے اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ سلسلہ ضرور جاری رہا۔ مامون اس میں بھی اپنے خاندان کے کسی خلیفہ سے پیچھے نہ رہا اُس نے یورپ میں تھوڑی سی فوج کابل کی طرف بھیجی اگرچہ یہ ملک پہلے بھی فتح ہو چکا تھا مگر اب کی بار وہاں کا بادشاہ اور اُس کی وجہ سے تمام ملک مسلمان ہو گیا ترکوں پر چڑھائی کی اور وہاں کا بھی ایک ترک بادشاہ مسلمان ہو گیا۔ تبت و کشمیر کی طرف بھی فوجیں بڑھیں یہاں بھی ایک راجہ مسلمان ہو گیا۔ سسلی یا صقلیہ جیسا اہم علاقہ بھی مامون ہی کے زمانے

ؔ خلیفہ کی جمع

میں فتح ہوا۔ روم پر اُس نے خود چڑھائی کی اور بہت سے شہر اور قلعے فتح کر لئے وہ روم بھی فتح کرنا چاہتا تھا موت نے جلدی کی۔ اور ۱۸ رجب ۲۱۸ھ ۸۳۳ء کو ۴۸ سال کی عمر میں سخت بخار کے مرض میں انتقال کیا۔ لاش طرسوس میں لاکر دفن کی گئی۔

اسپین کے علاوہ تمام اسلامی ملک عرب، مصر، ایران، افغانستان سندھ وغیرہ مامون کے قبضے میں تھے۔ حکومت کی سالانہ آمدنی کئی کڑوڑ درہم تھی۔ اور تمام حکومت میں امن وامان تھا۔ تجارت کی خوب گرم بازاری تھی۔ نئے نئے شہر آباد ہو رہے تھے۔ قصبے قصبے اور گاؤں گاؤں میں نہریں جاری تھیں۔ کھیتی باڑی خوب ترقی پر تھی۔ مامون خود بڑے بڑے شہروں کا دورہ اور انتظامات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ غریب محتاج، یتیم اور بیوہ سب کو حکومت کی طرف سے ماہوار مدد ملتی تھی۔ بے کار لوگوں کو یا تو کام دلایا جاتا تھا۔ یا وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔

مامون بہت منصف مزاج تھا ایک بڑھیا نے خود اُس کے بیٹے شہزادہ عباس پر دعوٰی کیا مقدمہ کے وقت مامون کے حکم سے بڑھیا اور شہزادہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے کئے گئے اور بڑھیا کا حق ثابت ہو گیا تو شہزادے سے جائداد واپس دلائی گئی ایک بار خود اُس پر تیس ہزار درہم کا دعوی کیا گیا مقدمہ کی پیروی کے لئے اُسے کچہری میں جانا پڑا نوکر اُس کے بیٹھنے کے لئے

قالین وغیرہ لائے۔ مگر قاضی نے کہا اس وقت آپ اور مدعی (دعوی
کرنے والا) دونوں برابر ہیں۔ مامون کو یہ بات ذرا بھی ناگوار نہ گزری
بلکہ اس نے قاضی کی تنخواہ بڑھا دی۔

علم سے محبت اور شغف میں وہ اپنے خاندان کے اگلے پچھلے
سب حکمرانوں سے سبقت لے گیا تھا۔ فلسفے سے اُسے خاص
دلچسپی تھی اس کے زمانے میں اس علم کو بہت ترقی ہوئی۔ اُس
کے باپ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں فلسفہ و حکمت کی کتابوں
کے ترجمے کے لئے ایک خاص محکمہ قائم تھا۔ بہت سے یہودی،
عیسائی، پارسی ترجمہ کے لئے ملازم تھے۔ مامون نے اس کام کو
اور پھیلایا۔ روم کے بادشاہ قیصر سے فلسفہ کی کتابوں کا پورا کتب
خانہ منگوالیا۔ ایران، ہندوستان اور عیسائی ملکوں میں خاص آدمی
بھیجے اور کتابیں تلاش کرا کر منگوائیں۔ دوسرے ملکوں کے بادشاہ
مامون کا یہ شوق دیکھ کر اسی قسم کے تحفے بھیجتے تھے۔ ہندوستان کے
ایک راجہ نے اپنے یہاں کے ایک مشہور حکیم کو مامون کی خدمت
میں تحفے کے طور پر بھیجا۔ غرض فلسفہ، ادب اور شاعری میں جو
ترقی مامون کے زمانہ میں ہوئی کسی زمانے میں نہیں ہوئی وہ خود بھی
بڑا عالم تھا اسی لئے صرف ان ہی لوگوں کی رسائی اُس کے دربار
میں ہو سکتی تھی جو علم میں ایک خاص درجہ اور امتیاز رکھتے ہوں۔
مگر مامون باوجود ہیبت اور وقار کے بہت بے تکلف اور سادہ

مزاج تھا۔ اپنے خاص خاص دوستوں سے اُس کا برتاؤ بالکل دوستانہ ہوتا تھا عالموں کی بہت قدر کرتا تھا یہ لوگ اکثر اُس کے مہمان ہوتے تھے۔ ایک رات قاضی یحییٰ بن اکثم اس کے مہمان تھے آدھی رات کو ان کی آنکھ کھل گئی۔ مامون نے پوچھا "خیر ہے" انھوں نے پیاس کی شکایت کی۔ مامون فوراً صراحی اُٹھا لایا۔ قاضی صاحب نے یہ دیکھا تو گھبرا کر کہا کہ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ خادموں کو حکم دے دیا ہوتا۔ مامون نے کہا نہیں! آں حضرتؐ نے فرمایا ہے کہ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور رات کو اُسے کھانسی آئی مگر اس خیال سے کہ قاضی صاحب جاگ نہ اُٹھیں منہ میں آستین ٹھونس لی۔

فراخ دلی اور سخاوت کا انداز بھی شاہانہ تھا اپنی شادی کے موقع پر اُس نے کاغذ کی گولیاں بنا کر پھکوائیں۔ ان کاغذ کے پرزوں پر زمین اور جائداد کا نام لکھا ہوتا تھا۔ اور جس شخص کو یہ گولی مل جاتی تھی وہ اس جائداد اور زمین کا مالک ہو جاتا تھا۔

بہت ہی حلیم اور بردبار تھا وہ خود کہتا ہے کہ معاف کرنے میں مجھے ایسا لطف آتا ہے اور ایسی لذت حاصل ہوتی ہے کہ خدا مجھے اس کا ثواب نہیں دے گا۔ ایک شخص کئی بار اُس کے حکم کی نافرمانی کر چکا تھا۔ مگر مامون نے اُس سے کہا تو جس قدر گناہ کرتا جائے گا میں معاف کرتا جاؤں گا یہاں تک کہ میرا عفو تجھ کو

تھکا کر ٹھیک کر دے۔ اسی عفو کے بھروسے پر لوگ ان کے سامنے اپنے جرم کا سچّا سچّا حال بیان کر دیتے تھے۔

ابونصر فارابی

ابونصر محمد بن طرخان فاریابی۔ وطن فاراب ہے جو ترکی علاقے میں ایک قصبہ ہے۔ فارابی یہیں ٢٥٩ھ / ٨٧٢ء میں پیدا ہوا اور یہیں پرورش پائی پھر علم حاصل کرنے کے لئے مختلف مقامات کا سفر کیا یہاں تک کہ بغداد پہنچا۔ وہ ترکی اور دوسری زبانیں اچھی طرح جانتا تھا۔ بغداد میں اس نے عربی بھی بہت محنت سے سیکھی۔ پھر فلسفے کی طرف توجہ کی یہاں اُس وقت یونس بن متّی بہت مشہور فلسفی حکیم تھا فارابی نے اُس سے فلسفہ پڑھا۔ یہاں سے وہ حران گیا اور ایک مشہور عیسائی فلسفی سے منطق سیکھی۔ یہاں سے پھر بغداد واپس آیا اور خود فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اُس نے ارسطو کی ایک کتاب کا سَو بار اور ایک دوسری کتاب کا چالیس بار مطالعہ کیا پھر بھی وہ کہتا تھا کہ ابھی میں ان کتابوں کو اور دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ فارابی بغداد میں عرصے تک رہا۔

یہاں تک کہ اس علم میں غیر معمولی مہارت پیدا کرلی اب وہ یہاں سے شام گیا لیکن شام میں وہ زیادہ دنوں نہیں ٹھیرا اور مصر چلا گیا یہاں اس نے اپنی مشہور کتاب الامامتہ والسیاستہ لکھی اس کے بعد وہ پھر شام واپس آیا۔ اس کی زندگی بالکل فلسفیوں کی سی تھی پہلے پہل وہ دمشق کے ایک باغ میں چوکیدار تھا۔ اس حالت میں بھی وہ بروقت فلسفے کے مطالعے میں مصروف رہتا تھا۔ غریبی کی یہ حالت تھی کہ رات کو چراغ کے لئے بھی پیسے میسر نہیں تھے۔ دوسرے چوکیداروں کے چراغ سے کام لیتا تھا۔ اس زمانے میں یہاں سیف الدولہ کی حکومت تھی اُس کو جب فارابی کے علم و فضل کی خبر ہوئی تو اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اسی کے دربار کا ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک بار اُس نے ساز بجایا جس سے سب رونے لگے دوسری مرتبہ دوسری طرح بجایا اور سب ہنسنے لگے۔ تیسر دفعہ اور طریقہ سے بجایا اور سب کو نیند سی آنے لگی۔

فارابی تنہائی بہت پسند کرتا تھا۔ دمشق میں جب تک رہا اکثر یا تو کسی چشمے کے کنارے یا درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر اپنا کام کرتا تھا۔ یہیں آکر اُس کے شاگرد اُس سے پڑھتے تھے۔ مزاج میں لا پروائی بہت تھی۔ اپنی کتابیں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر لکھتا تھا۔ اسی لئے اس کی بہت سی کتابیں منتشر اور بعض نامکمل ہیں۔ اسے روپیہ کمانے کی فکر کبھی نہ ہوئی اور نہ کبھی رہنے کو مکان

بنایا۔ سیف الدولہ کے یہاں سے چار درہم روزانہ ملتے تھے اسی پر قناعت کرتا تھا۔ عمر بھر یہی حال رہا آخر اسّی برس کی عمر میں ۳۳۹ھ/۹۵۰ء میں انتقال کیا خود سیف الدولہ اور اُس کے درباری جنازے کی نماز میں شریک تھے۔

فارابی مسلمانوں میں بہت بڑا فلسفی تھا۔ شیخ الرئیس ابن سینا اور دوسرے مشہور مسلمان فلسفیوں نے اُس کی کتابوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ فارابی نے فلسفہ اور فلسفے کے متعلق اور تمام علوم و فنون میں مہارت حاصل کی تھی۔ بعض ایسے عنوانوں پر اُس نے کتابیں لکھی ہیں کہ اس سے پہلے نہیں لکھی گئی تھیں۔ مثلاً کتاب السیاستہ المدنیہ احصار العلوم۔ مدنی سیاست، یہ ایک خاص علم ہے اور یورپ والے سمجھتے ہیں کہ پہلے یہ موجود نہ تھا خاص یورپ کے عالموں کی ایجاد ہے حالانکہ یہ مسلمان فلسفی آج سے ایک ہزار سال پہلے اس علم میں کتاب لکھ چکا ہے۔ فارابی نے موسیقی کے علم میں خاص طور پر مہارت حاصل کی تھی اُس نے قانون کے نام سے موسیقی کا ایک آلہ بھی ایجاد کیا تھا۔

فلسفے کی کتابوں کے جو ترجمے اب تک ہوئے تھے ان میں بہت کچھ اصلاح کی گنجائش تھی۔ فارابی نے ان کی اصلاح کی اور انھیں مختصر کیا اور اپنی کتاب کا نام "التعلیم الثانی" رکھا۔

امام ابوالحسن اشعریؒ

ابوالحسن علی بن اسمٰعیل اشعریؒ حضرت ابوموسیٰ اشعری کی اولاد میں ہیں جو بہت بڑے صحابی تھے۔ امام صاحب ۲۶۰ھ/۸۷۴ء میں پیدا ہوئے اور ۳۳۰ھ/۹۴۱ء میں انتقال کیا بچپن ہی سے بہت تیز اور ذہین تھے۔ ان کے استاد بہت بڑے عالم تھے مگر مناظرہ٭ (بحث ومناظرہ) کے فن سے زیادہ واقف نہ تھے اس لئے جب کبھی اس قسم کی ضرورت پیش آجاتی تھی یہ امام صاحب کو اپنا نائب بنا کر بھیج دیتے تھے۔ انھوں نے شروع ہی سے معتزلی مذہب اختیار کر لیا تھا اور چالیس برس تک اس مذہب پر قائم

٭ مناظرہ اُسے کہتے ہیں کہ دو شخصوں میں کسی بات پر اختلاف ہو اور وہ اس نیت سے ایک دوسرے سے بحث کریں کہ جس کی بات سچی ہوگی اُسے مان لیں گے۔ مسلمانوں نے اسے بھی ایک فن بنالیا ہے۔

رہے ایک بار وہ اچانک اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ پندرہ روز کے بعد جمعے کو عام مسلمانوں کے سامنے اس مذہب سے توبہ کی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں ان سے کئی بار تاکید کی کہ اُٹھو اور میرے سچے اور صحیح مذہب کی تائید اور مدد کرو۔ اس زمانے میں مذہب اعتزال کا بہت زور تھا مگر اُنھوں نے اپنی علمی اور عملی کوششوں سے بہت کمزور کر دیا۔

امام صاحب تمام اسلامی علوم میں ماہر تھے۔ خصوصاً علم کلام[۵] میں انھیں خاص حیثیت حاصل تھی مذہب اعتزال سے توبہ کرنے کے بعد انھوں نے اس مذہب اور اسی قسم کے دوسرے مذہبوں کے رد میں بہت سی کتابیں لکھیں ان کتابوں کو بہت مقبولیت

---

۵ اس زمانے میں مسلمانوں میں منطق اور فلسفے کا بہت رواج ہو گیا تھا۔ اور بہت سے لوگ مذہب کو فلسفہ یا یوں کہو کہ عقل کی کسوٹی پر کستے تھے یعنی مذہب میں یہ بات عقل کے خلاف ہے۔ بہت سے دوسرے مذہب کے فلسفی بھی اسلام پر اسی قسم کے اعتراض کرتے تھے ایسے لوگوں کے شبہے فلسفے ہی کے اصول پر دور کیے جاتے تھے۔ بس یہی علم کلام ہے بعد میں اس علم نے بہت ترقی کی۔

حاصل ہوئی اور ان کے اصولوں کو ماننے والے ان کی زندگی ہی میں بہت سے پیدا ہو گئے یہاں تک کہ ایک خاص فرقہ (اشعری) ان کے نام سے منسوب ہو گیا۔ امام صاحب نے کوئی نیا عقیدہ یا نیا مذہب جاری نہیں کیا تھا بلکہ وہ اسی عقیدے پر قائم تھے جو صحابہ کے زمانے میں تھا لیکن انھوں نے ایسے وقت میں اسے پھیلایا جب لوگوں کے ایمانوں میں پہلی سی وہ مضبوطی باقی نہیں رہی تھی۔ انھوں نے اس کام میں بہت کوشش کی۔

امام صاحب تقریر بہت اچھی کرتے تھے ان پر جو اعتراض کئے جاتے تھے اس کا جواب اس طرح دیتے تھے کہ معترض کے لئے دوبارہ اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔

ایک بہت بڑے عالم کا بیان ہے کہ امام صاحب کی شہرت سن کر میرے دل میں ان سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی میں جا رہا تھا کہ راستے میں بہت ہی نورانی صورت کے ایک بڑے بزرگ ملے میں نے ان سے امام اشعری کا پتہ پوچھا انھوں نے دریافت کیا "میاں! تم کس لئے ان سے ملنا چاہتے ہو" میں نے کہا "صرف ملنا چاہتا ہوں اور کوئی غرض نہیں" انھوں نے کہا "تو کل صبح اسی جگہ آ جانا۔ دوسرے دن میں صبح ہی پہنچ گیا یہ بزرگ بھی آ گئے تھے میں ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا اور دونوں ایک شاندار مکان میں داخل ہو گئے یہاں عالموں کا

مجمع تھا اُن کی وہاں بہت عزت کی گئی صدر میں بٹھائے گئے اور لوگ ان کے چاروں طرف جمع ہو گئے ایک صاحب نے ان پر اعتراض کیا اور انھوں نے اس فصاحت اور دل نشین انداز میں جواب دیا کہ معترض کو دوبارہ اعتراض کی ہمت نہ ہوئی۔ میں نے تعجب سے پوچھا یہ بزرگ آخر ہیں کون۔ معلوم ہوا کہ ابوالحسن اشعری یہی ہیں۔ یہاں سے رخصت ہونے کے بعد میں پھر اُن کے ساتھ ہو گیا امام صاحب فرمانے لگے "میاں! اشعری کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے" میں نے بہت ادب سے عرض کیا "یا حضرت! جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔"

امام صاحب کے مزاج میں خوش طبعی اور مذاق بھی بہت تھا۔ ایک بار معتزلہ سے مباحثہ ہوا وہ بہت سے تھے مگر امام صاحب نے سب کو ہرا دیا وہ لوگ دوسرے دن پھر آنے کا وعدہ کر گئے۔ مگر پھر انھیں آنے کی ہمت نہیں ہوئی امام صاحب نے ازراہ تمسخر ایک لڑکے سے کہا دروازہ پر لکھ دو "بھگوڑے بھاگ گئے"

امام صاحب کو تصوف سے بھی لگاؤ تھا۔ بہت عابد و زاہد تھے اکثر صبح اور عشاء کی نماز ایک ہی وضو سے پڑھتے تھے۔ اپنے خرچ میں بھی بہت احتیاط کرتے تھے ان کے دادا نے کچھ زمین اپنی اولاد کے لئے وقف کر دی تھی اسی کے نفع پر گذر تھی صرف ۱۷ درہم سالانہ خرچ کرتے تھے مہینہ میں ڈیڑھ

درہم سے بھی کم۔

علامہ ابن حزم نے امام صاحب کی تصانیف کی تعداد پچاس[۵۰] بتائی ہے مگر اور لوگوں نے دو سو[۲۰۰] سے بھی زائد کتابیں گنائی ہیں

مُتنبّی

ابوالطیب احمد بن الحسین بن الحسنی الکندی کوفی۔ عرب کا مشہور شاعر، باپ کوفے کا بھشتی تھا اپنے محلہ کندہ میں پانی پلاتا تھا۔ اور لوگوں میں عبدان سقہ کے نام سے مشہور تھا۔ متنبی اسی محلے میں پیدا ہوا اور یہیں پرورش پائی۔ بچپن سے پڑھنے لکھنے کی طرف طبیعت کو رغبت تھی اکثر عالموں کی صحبت میں بیٹھتا یا کتب فروشوں کی دُوکانوں پر چلا جاتا۔ حافظہ بہت اچھا تھا جو کتاب ایک دفعہ پڑھ لیتا برزبان ہو جاتی ایک دن کسی کتاب بیچنے والے کے یہاں اصمعی کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا کوئی ۲۰ ورق کی ہوگی پاس ہی دلال بیٹھا تھا، اُس نے کہا میں اسے بیچنا چاہتا ہوں اور "تم ہو کہ پڑھ ہی نہیں چکتے" اگر خریدنا ہے تو جلد خرید لو اور اگر حفظ کرنا

---

۵ پہلے کتابیں بھی دلالوں کے ذریعے بیچی جاتی تھیں۔

چاہتے ہو تو اس کے لئے ایک مہینہ درکار ہے۔ متنبی نے کہا: اگر میں نے اسی وقت حفظ کر لیا تو کیا دو گے۔ دلال نے کہا یہ کتاب تمہیں دے دوں گا۔ متنبی نے شروع سے آخر تک ساری کتاب حفظ سنا دی اور کتاب لے کر چلتا ہوا۔

باپ نے ہونہار بیٹے میں پڑھنے لکھنے کا اس قدر شوق دیکھا تو ہر طرح امداد کی اسے شام لے گیا اور وہاں کے مشہور ادیبوں اور عالموں سے تعلیم دلائی آخر متنبی نے ادب کے علم میں غیر معمولی کمال حاصل کر لیا۔

متنبی کے ارادے بہت بلند تھے، شہرت کی ہوس اور سرداری و حکومت کی خواہش اُسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ چنانچہ اس نے پہلے اپنے شہر کے چند نوجوانوں کو اپنی بیعت پر آمادہ کیا اور تھوڑے دنوں میں اچھی خاصی خلقت اس کے گرد جمع ہو گئی۔ شہر کے حاکم کو اس فتنے کی خبر ہوئی تو اسے قید کر دیا اور توبہ کرا کے چھوڑ دیا۔

لیکن تھوڑے دنوں بعد پھر وہی جنون سوار ہوا، اب کے بجائے امامت اور حکومت کے نبوت کے خواب دکھائی دینے لگے۔ عرب کے دیہاتوں میں جا کر بدوؤں میں اپنا مذہب پھیلانا شروع کیا قرآن کی سورتوں کے مقابلے میں اپنی بنائی ہوئی سورتیں ان کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اسی طرح سے لوگوں کو

اپنا موافق بنا لیا اور بہت بڑی جماعت اس کے ساتھ ہو گئی۔ لیکن حمص کے امیر نے اس جماعت کا قلع قمع کر دیا اور اس کو پھر قید میں ڈال دیا۔ ایک عرصے تک جیل خانے کی تکلیفیں اُٹھاتا رہا۔ آخر اس سے عہد لیا گیا کہ آئندہ اس قسم کا فتنہ نہ اُٹھائے گا۔ تب رہائی ملی۔ نبوت کے دعوے کی وجہ سے متنبی کے نام سے شہرت پائی اور ہمیشہ کے لئے اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ قید سے رہائی پانے کے بعد متنبی نے نبوت کا خیال بالکل چھوڑ دیا اور ادب کی طرف توجہ کی کہ شاید اسی کے ذریعے کسی چھوٹے سے علاقے ہی کی حکومت مل جائے اور امیروں اور بادشاہوں کی شان میں قصیدے لکھنے شروع کئے۔ اس زمانے میں سیف الدولہ بہت مشہور بادشاہ تھا اُس کے پاس اور بھی بہت سے نامی شاعر اور ادیب تھے اُس نے متنبی کو بھی خاص طور پر دربار میں بلایا۔ اور بہت عزت کے ساتھ رکھا۔ یہاں بھی متنبی کی خودداری، شان اور اکڑ کا وہی حال تھا۔ کبھی اُس نے دوسرے شاعروں کی طرح کھڑے ہو کر قصیدہ نہیں پڑھا۔ آخر سیف الدولہ سے کسی بات پر ناراض ہو کر دمشق چلا گیا وہاں سے مصر گیا اور ملک کافور بادشاہ مصر کے دربار میں ملازم ہو گیا۔ ملک کافور نے بڑے اصرار سے اسے بلایا تھا اس لئے بڑی آؤ بھگت کرتا تھا اسے ایک علاقے کا حاکم بنا دینے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ لیکن مصلحتاً ٹال مٹول کرتا تھا

تنبی بھی اس کی اس ٹال مٹول سے ناراض ہوکر مصر سے بغداد چلا گیا اور کافور کی شان میں سخت ہجو لکھی۔

بغداد میں خلیفہ کے وزیر سے اس کی اَن بَن ہو گئی۔ وزیر نے بغداد کے شاعروں کو اشارہ کر دیا انھوں نے اس کی خوب ہجو کہی اور ہر طرح اُسے ذلیل کرنا چاہا مگر اُس نے انھیں توجہ کے قابل نہیں سمجھا اور کسی کی ہجو کا جواب نہ دیا۔

بغداد سے وہ کوفے آیا۔ کوفے سے کاتب ابن العمید رکن الدولہ کے وزیر کے پاس گیا۔ اور عرصے تک اس کے پاس بہت عزت سے رہا پھر رکن الدولہ نے اُسے شیراز بلا لیا اور اُس کی تمام آرزوئیں پوری کر دیں۔ لیکن وہ یہاں زیادہ عرصے تک نہیں ٹھیرا۔ اور رکن الدولہ سے اجازت لے کر بغداد روانہ ہو گیا راستے میں بغداد کے قریب پہنچا تو ایک شخص فاتک بن جہل اور اُس کے ساتھیوں سے اس کا مقابلہ ہو گیا اور یہ اس کا بیٹا اور اس کا غلام تینوں مارے گئے اور ان کا تمام مال واسباب ان لوگوں نے لوٹ لیا۔

مرنے کے بعد بہت سے شاعروں نے اس کے مرثیے لکھے۔ عرصے تک لوگوں کو اس کی اس طرح موت کا افسوس رہا۔

تنبی اپنے زمانے میں عربی کا بہترین شاعر تھا اس کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جوں ہی وہ کوئی

قصیدہ لکھتا تھا، فوراً تمام عرب میں پھیل جاتا تھا اور زبانوں پر چڑھ جاتا تھا۔ اس نے لوگوں کی تعریف میں قصیدے بھی لکھے ہیں ناراض ہوکر ہجو بھی لکھی ہے اور مرثیے بھی لکھے ہیں اس کے بعض شعر وعظ و نصیحت میں بھی ہیں اور بہت عمدہ ہیں۔ اس کے مرتے ہی اس کے تقریباً تمام شعر ایک دیوان کی صورت میں مرتب کر لئے گئے یہ دیوان اب تک عربی مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اس کے بعض شعروں میں غلطیاں نکالی ہیں اور بہت سے عالموں نے اس کی طرف سے ان اعتراضوں کے جواب دئے ہیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

ابن ہیثم

ابو علی الحسن بن الحسن بن الہیثم۔ غالباً ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء میں لبصرے میں پیدا ہوا ابتدائی تعلیم کے بعد فلسفہ اور طب پڑھی۔ فلسفے سے جتنے علم نکلتے تھے ان سب میں کمال حاصل کیا۔ خصوصاً ارسطو کے فلسفے میں خاص مہارت پیدا کی۔ علم طب سے پوری طرح واقف تھا مگر کبھی مطب نہیں کیا۔ پہلے وہ بصرے کے حاکم کا وزیر تھا مگر اس کی طبیعت کا رجحان پڑھنے لکھنے کی طرف تھا اس لئے جلد ہی اس مشغلے سے اُکتا گیا۔ اس منصب سے اپنا پیچھا چھڑا کر مصر چلا گیا۔

مصر میں اُس نے قاہرہ کے مشہور مدرسے جامع ازہر میں قیام کیا۔ اس کا خط بہت اچھا تھا اس لئے دوسروں کی کتابیں نقل کر کے بیچتا تھا یہی گذر اوقات کا ذریعہ تھا۔ اس زمانے میں مشہور فاطمی خلیفہ حاکم کی حکومت تھی حاکم کو فلسفہ و حکمت سے

بہت دلچسپی تھی۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ مصر میں اتنا بڑا فلسفی آیا ہے تو اُسے ملنے کا شوق ہوا۔ پھر کسی نے اُس سے ابن ہیثم کا یہ قول بھی نقل کیا کہ اگر میں مصر میں رہتا تو دریائے نیل کا ایسا بند بند ھواتا کہ اس میں پانی کم ہوتا یا زیادہ ملک کو ہمیشہ اُس سے بجائے نقصان کے نفع ہی پہنچتا۔ یہ سن کر اُس کا اشتیاق اور بھی زیادہ ہوا اُس نے بہت سا روپیہ اور ساز و سامان اُس کے پاس بھیجا اور اپنی خدمت میں حاضر ہونے کی ترغیب دی جب وہ دربار میں آیا تو بہت عزت واحترام کے ساتھ پیش آیا اور دریائے نیل کے متعلق جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا کرنے کی فرمائش کی۔

ابن ہیثم بہت سے معماروں اور مزدوروں کے ساتھ اس مقام پر گیا جس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ اپنے نقشہ کے مطابق بند بنوا سکے گا مگر وہاں جا کر اور بہت سی پچھلی قوموں کے بنائے ہوئے بندوں کے کھنڈر دیکھے ان قوموں نے کاریگری اور انجینیری میں اپنے ذہن و دماغ کی پوری طاقتیں صرف کر دی تھیں۔ پھر بھی اُنھیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر ابن ہیثم کی ہمت ٹوٹ گئی۔ کیوں کہ اس کا علم اُن لوگوں سے زیادہ نہ تھا چنانچہ اُسے بہت شرمندگی حاصل ہوئی اور خلیفہ سے اپنی ناکامی کی معذرت کی۔ حاکم نے اس کی معذرت قبول کی اس کی عزت میں کوئی فرق نہ آنے دیا اور حکومت کے چند دفتروں

کا افسر بنا دیا ابن ہیثم نے اس عہدے کو خوشی سے نہیں قبول کیا اسی لئے کہ یہ بادشاہ بہت ظالم اور خونخوار تھا۔ انسانوں کا خون بغیر کسی سبب کے بہاتا تھا۔

اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی یہ تدبیر اُس کی سمجھ میں آئی کہ پاگل بن گیا۔ حاکم نے اس کے مال واسباب اور خود اس پر نگرانی کے لئے آدمی مقرر کردئے اور اُسے اُسی کے مکان میں قید کردیا۔ جب خلیفہ حاکم کا انتقال ہوگیا تو کچھ دنوں بعد وہ خود ہی اچھا خاصا ہوگیا اس کا جو کچھ مال واسباب تھا وہ بھی اُسے واپس کردیا گیا۔ اب وہ اپنے گھر سے نکل کر پھر جامع ازہر چلا آیا۔ اور اُس کے دروازے کے گنبد میں رہنے لگا۔ یہاں پھر وہ تصنیف وتالیف۔ کتابیں نقل کرنے اور پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہوگیا۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ کتابیں نقل کرنا تھا۔ سال بھر میں تین کتابیں نقل کرتا تھا اور جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اُس سے سال بھر کا خرچ چلاتا تھا۔ صبر وقناعت اُس کی فطرت میں داخل تھا۔ حکومت کے عہدے یا زیادہ مال ودولت حاصل کرنے کی اُس نے کبھی کوشش نہیں کی۔

ابن ہیثم نے ۴۳۰ھ ۱۰۳۰ء میں یا اس کے تھوڑے دنوں بعد قاہرہ میں انتقال کیا۔

ابن ہیثم اپنے زمانے کا بہت بڑا عالم تھا۔ بہت سے ملکوں

میں اُسے مہارت تھی علم ہندسہ اور ریاضی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ محنت کا یہ حال تھا کہ ہر وقت لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتا تھا۔ فلسفے میں ارسطو اور طب میں جالینوس کی بہت سی کتابوں کا خلاصہ کیا۔ ہندسہ۔ ہیئت، اور فلسفے پر اس کی کئی تصانیف ہیں۔ علم طب میں کتاب المناظر اس کی بہت اہم اور معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ اس کی کئی کتابیں لاطینی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور عرصہ تک یورپ میں رائج رہی ہیں۔

ابوریحان بیرونی

ابوریحان محمد بن احمد بیرونی ذی الحجہ ۳۶۲ھ / ۹۷۲ء کو خوارزم میں پیدا ہوا۔ شروع میں وہ بہت غریب تھا۔ مگر اُس کے پڑھنے لکھنے کا شوق اُس کی غریبی پر غالب آیا۔ ذہن اور حافظہ بہت اچھا تھا طبیعت بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کی طرف مائل تھی۔ خوش نصیبی سے استاد بھی بہت اچھے مل گئے جن کی بدولت اُس نے تھوڑی عمر میں منطق، فلسفہ، نجوم (ستاروں کا علم) اور دوسرے علوم میں کمال حاصل کرلیا مگر غریبی کی وجہ سے اُسے تعلیم کے زمانہ میں اور تعلیم کے بعد بڑی پریشانیاں اور تکلیفیں اُٹھانا پڑیں یہاں تک کہ روزگار کی تلاش میں وطن چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ کچھ عرصے تک پریشانی کی حالت میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرا لیکن اس کے علمی مشغلے اس حالت میں بھی جاری تھے۔ اسی وجہ سے بہت جلد اس کی علمی قابلیتوں نے شہرت حاصل کرلی۔

اس زمانے میں شمس المعالی قاموس بن وشمگیر جرجان کا بہت ہی شریف اور علم دوست امیر تھا۔ اُس نے بیرونی کی علمی شہرت سنی تو اپنے پاس بلا لیا اور اس کی غیر معمولی قابلیت سے واقف ہو کر اس کی بہت قدر کی۔ بیرونی کو بھی اب کچھ اطمینان اور فراغت نصیب ہوئی۔ اور یکسوئی و اطمینان کے ساتھ علمی کاموں میں مشغول ہو گیا۔ یہاں اُس نے آثار الباقیہ اور علم نجوم پر ایک کتاب لکھی۔

۱۰۰۹ء میں وہ اپنے وطن واپس آیا۔ اس مرتبہ یہاں کے امیر مامون نے اس کی بہت آؤ بھگت کی اور ہاتھوں ہاتھ لیا خوارزم میں رہتے بیرونی کو کچھ عرصہ گذرا تھا کہ سلطان محمود غزنوی نے امیر مامون سے خواہش کی کہ اپنے دربار کے عالموں کو اس کے یہاں بھیج دے۔ امیر مامون دل سے اس پر راضی نہ تھا مگر چوں کہ سلطان محمود اس زمانے کا بہت باجبروت بادشاہ تھا اس لئے انکار بھی نہ کر سکا اور مجبوراً اپنے دربار کے عالموں کو محمود کے یہاں جانے کا حکم دیا۔ کچھ لوگوں نے جانے سے انکار کر دیا اور دوسرے مقامات میں چلے گئے۔ صرف بیرونی اور بعض دوسرے عالم دربار میں شامل ہوئے۔ مگر بیرونی کا دل بہت جلد وہاں سے اُکتا گیا اور خوارزم واپس آ گیا۔ اس مرتبہ یہاں فتنہ وفساد برپا ہو گیا۔ باغیوں نے ماموں کو قتل کر دیا اور تمام ملک میں ایک عجیب ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ محمود تو اس موقع کی تاک میں تھا فوراً

اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔ خوارزمی خاندان تباہ و برباد اور سلطان محمود کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ بیرونی کو اپنے ملک کی تباہی اور بادشاہی خاندان کی بربادی کا بڑا رنج تھا۔ ستم پر ستم یہ ہوا کہ خوارزم کے دربار کے جتنے بڑے بڑے عالم تھے محمود نے ان سب کو گرفتار کرلیا۔ بیرونی بھی ان ہی میں تھا۔ کچھ دنوں بعد اس مصیبت سے نجات ملی۔ سلطان محمود غزنوی نے اسے دوبارہ اپنے درباریوں میں شامل کرلیا۔

غزنیؔ میں چند ہندو عالموں سے بیرونی کی ملاقات ہوئی۔ اور اُس کے دل میں ہندوستان کا فلسفہ اور دوسرے علوم و فنون پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۰۱۷ء میں اسی غرض سے وہ ہندوستان گیا۔ یہاں اس نے تیرہ چودہ سال قیام کیا ہندو پنڈتوں کو اپنے علم سکھائے اور خود اُن کے علم سیکھے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ بہت سی باتوں کی تحقیقات کی اور ہندوستان کے علوم و فنون اور تاریخ وغیرہ سے متعلق کتاب الہند کے نام سے ایک بہترین کتاب لکھی۔ علاوہ اس کے ہندوؤں کی اور بہت سی کتابوں کے ترجمے کئے۔

۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں سلطان محمود غزنوی کا انتقال ہوگیا تو اس کا

ٖ؎ یہ سلطان محمود غزنوی کا دارالسلطنت تھا۔

بیٹا سلطان مسعود غزنوی اُس کا جانشین ہوا۔ سلطان مسعود نے بھی بیرونی کی بہت عزت کی۔ بیرونی نے اسی زمانے میں ایک شاندار رصدگاہ بنوائی۔ جہاں آسمان اور ستاروں کے متعلق تحقیقات ہوتی تھی۔ علاوہ اس کے اُس نے اس علم (علم ہیئت) سے متعلق ایک کتاب قانون مسعودی کے نام سے لکھی۔ سلطان مسعود نے ایسی اچھی اور عالمانہ تصنیف پر ہاتھی برابر چاندی تول کر انعام میں دی مگر اس مسلمان فلسفی نے اس قدر کثیر دولت خزانے میں واپس کردی آخر ۱۰۴۸ء میں مسلمانوں کے اس بڑے فلسفی نے ۷۷ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ بیرونی نے بچپن سے لے کر موت تک ساری زندگی علم کی خدمت میں گذاری اُس کے بچپن اور جوانی کا زمانہ بڑی پریشانی کا تھا اُس پر بڑی بڑی مصیبتیں پڑیں۔ لیکن اس باہمت انسان نے ان پریشانیوں کا ہمیشہ مستقل مزاجی سے مقابلہ کیا۔ منطق، فلسفہ، ریاضی اور ہیئت میں اس کا پایہ بہت زبردست ہے۔ بعض مشہور عالموں کا خیال ہے کہ ان علوم میں مسلمانوں میں کوئی بھی بیرونی کے مقابلے کا پیدا نہیں ہوا۔ اس نے ڈھائی سو سے زیادہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں چند اب تک موجود ہیں۔ مثلاً کتاب الہند اور قانون مسعودی ان کتابوں کا

ٰ عربی زبان میں اس علم کو علم ہیئت کہتے ہیں۔

یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مشہور فلسفی اور حکیم شیخ الرئیس بوعلی سینا بھی اسی زمانے میں گزرا ہے۔ بیرونی میں اور اس میں بہت سے مسئلوں پر مباحثے بھی ہوئے ہیں یہ مباحثے اسی زمانہ میں لکھ لئے گئے ہیں۔

ابو بکر زکریا رازی

"علم طب کو جالینوس نے زندہ کیا، رازی نے جمع کیا اور ابن سینا نے مکمل کیا"

ابو بکر محمد بن زکریا رازی رے میں پیدا ہوا۔ بچپن اور نوجوانی میں گانا اور ستار بجاتا تھا جب داڑھی نکل آئی تو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ "داڑھی مونچھوں کے درمیان سے کوئی گانا نکلتا ہوا اچھا نہیں معلوم ہوتا" فلسفہ اور منطق کا اسے شروع سے شوق تھا چنانچہ یہ علوم اور علم ادب ساتھ ساتھ پڑھتا تھا اور شعر بھی کہتا تھا۔ ۳۰ برس کی عمر میں بغداد گیا وہاں اُسے شفاخانہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ شفاخانے میں جاکر اُس نے طبیبوں سے ملاقات کی۔ عجیب عجیب مریضوں کو دیکھا اور طب کے متعلق دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ یہ چیزیں دیکھ کر اُس کے دل میں بھی طب پڑھنے کا ولولہ پیدا ہوا۔ بہت جلد اس میں کمال پیدا کرلیا اور رفتہ رفتہ اتنی شہرت حاصل کی کہ اپنے وقت کا امام سمجھا جانے لگا۔ بڑی دور دور کے طالب علم اس کے

پاس طب پڑھنے آتے تھے۔ آخر بغداد کے مشہور شفا خانے میں تمام طبیبوں کا صدر بنا دیا گیا۔

مطب اور تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے اس کے خاص شاگرد اس کے بالکل قریب بیٹھتے تھے پھر ان شاگردوں کے شاگرد اور پھر سب سے آخر میں شاگردوں کا ایک تیسرا جتھا۔ کوئی مریض آتا تھا تو پہلے آخری صف کے طالب علموں سے اپنا حال کہتا تھا یہ جماعت اگر مرض پہچان نہ سکتی تھی تو دوسری صف کے پاس بھیج دیا جاتا تھا وہ بھی ناکام رہتی تھی تو پہلی صف کے پاس سب سے آخر میں ابوبکر زکریا رازی کے پاس جاتا تھا وہ مریض کو دیکھتا تھا مرض کی تشخیص[۱] کرتا اور اس مرض پر طالب علموں کے سامنے بحث کرتا تھا۔

اس کا قیام زیادہ تر رے اور فارس کے ملکوں میں رہا ہے۔ اپنے اس فن کے ذریعے اُس نے بادشاہوں اور امیروں کی بھی بہت خدمت کی ہے اور اُن کے لئے کتابیں لکھی ہیں۔ اُس نے منصور سامانی[۲] کے لئے بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں کیمیا کے علم کو صحیح ثابت کیا تھا۔ منصور نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور

---

[۱] مرض پہچاننے اور معلوم کرنے کو تشخیص کہتے ہیں۔
[۲] سامانی خاندان کا مشہور بادشاہ۔

ایک ہزار دینار انعام میں دیئے ساتھ ہی یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا عملی تجربہ کیا جائے۔ لیکن باوجود بہت دنوں تک کوشش کرنے کے عملی تجربہ میں وہ کامیاب نہیں ہوا منصور اس بات سے بہت ناراض ہوگیا اور کہا:۔

"تمام لوگ کتاب دیکھ کر کیمیا بنانے کی طرف مائل ہوں گے اور خواہ مخواہ اپنا سر کھپائیں گے میں نے اس کتاب پر انعام دیا تھا لیکن اب سزا بھی دینی لازم ہے۔" چنانچہ اس نے ابوبکر کے سر پر کوڑے لگوائے اور وہی کتاب اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ آنکھوں میں پانی اُتر آیا اور اندھا ہوگیا۔ پھر اُسے بغداد بھجوا دیا۔ لوگوں نے اس سے کہا بھی کہ آپریشن کرالو مگر اس نے جواب دیا "دنیا کو بہت دیکھ لیا۔"

اُس کے یہاں کھانا بہت مزے دار پکتا تھا۔ ایک وزیر نے اُس کے یہاں کھایا تو بہت پسند آیا وہ اِسے ابوبکر کے باورچی اور لونڈی کا ہنر سمجھتا تھا۔ ان دونوں کو اپنے یہاں بلوا لیا مگر وہ بات پھر بھی نہ پیدا ہوئی آخر اسے کسی نے بتایا کہ ابوبکر کیمیا جانتا ہے۔ وزیر نے یہ علم اس سے سیکھنا چاہا مگر ابوبکر نے انکار کر دیا اس پر وزیر کو غصہ آگیا اور چپکے سے مروا ڈالا لیکن یہ روایت یقین کے قابل نہیں ہے بہرحال ۳۲۰ھ ۹۳۲ء یا بعض لوگوں کے نزدیک ۳۶۴ھ ۹۷۴ء میں اس کا انتقال ہوا۔

ابو بکر ایک شریف اور ہمدرد طبیب تھا۔ امیر اور غریب دونوں سے بہت اچھی طرح پیش آتا تھا۔ نبض بہت غور سے دیکھتا اور تشخیص سوچ سمجھ کر کرتا تھا، پھر علاج میں غیر معمولی توجہ سے کام لیتا تھا اور مریض کو اچھا کرنے میں کسی ممکن کوشش سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے تشخیص کی طرف منتقل ہوتا تھا۔ اور مرض کو جلد سے جلد پورے طور پر پہچان لیتا تھا۔ اس نے بڑے معرکے کے علاج کئے ہیں۔ ایک دلچسپ قصہ بہت مشہور ہے۔ ایک لڑکا والدین کے ساتھ بغداد سے رَے آیا راستے میں اسے سل اور دق ہو گئی اور خون تھوکنے لگا۔ ماں باپ اسے علاج کے لئے ابو بکر زکریا کے پاس لائے اس نے نبض دیکھی۔ خون دیکھا۔ حالات پوچھے، بہت غور کیا مگر مرض کا پتہ نہ چلا۔ آخر دریافت کیا کہ پانی کہاں کہاں پیا ہے جواب ملا کہ مختلف نہروں اور تالابوں سے۔ فوراً اس کے ذہن میں یہ بات آگئی کہ پیٹ میں جونک چلی گئی ہے۔ اُس نے بہت سی دریائی گھاس منگوائی اور لڑکے سے زبردستی نگلوائی تھوڑی دیر میں اُسے قے ہوئی اور گھاس کے ساتھ جونک بھی باہر آگئی۔

ابو بکر بے انتہا محنتی تھا ایک شخص کا بیان ہے کہ وہ ہر وقت کام میں مشغول رہتا تھا میں جب اُس کے پاس گیا اُسے

لکھتے ہوئے دیکھا یا تو مسودہ لکھتا تھا یا مسودہ صاف کرتا تھا۔ طب کے متعلق نئی نئی معلومات حاصل کرتا اور طب کے پچھلے عالموں نے جو کچھ لکھا تھا اس سے واقفیت حاصل کرتا۔

اس کی تصانیف نہایت اہمیت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں اس نے تمام طبی علوم کو جو اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے اپنی کتابوں میں جمع کر دیا ہے۔ بعض کتابیں اُس نے تیس تیس جلدوں میں لکھی ہیں اس کا خیال تھا کہ جہاں تک ہو سکے غذاؤں کے ذریعہ علاج کیا جائے یا جہاں تک ممکن ہو مفرد دواؤں کے ذریعہ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ طبیب پڑھا لکھا سمجھدار اور مریض اطاعت شعار ہو تو مرض بہت جلد دور ہو جائے گا۔ اس کی بہت سی کتابیں یورپ، مصر، قسطنطنیہ وغیرہ کے کتب خانوں میں ہیں اور بعض چھپ بھی گئی ہیں۔

اِبنِ سینا

شیخ الرئیس ابو علی الحسین بن عبداللہ بخاری کے ایک قصبے خرتین میں ۳۷۰ھ/۹۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اس نے خود اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں جنھیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

"میں خرتین میں پیدا ہوا۔ پھر کچھ عرصے بعد بخارا لایا گیا۔ یہاں قرآن حفظ کیا ادب کی بہت سی کتابیں پڑھیں اور دس برس کی عمر میں اتنا علم حاصل کر لیا کہ لوگ حیرت کرتے تھے۔ میرا خاندان اسمٰعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے بھی لوگ شوق دلاتے تھے کہ اس فرقے میں شامل ہو جاؤں۔ لیکن میں نے کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ اپنی بات چیت میں اکثر علم فلسفہ، علم ہندسہ اور ہندوستان کے حساب کا ذکر کرتے تھے۔ یہاں اتفاق سے ایک کنجڑا (سبزی فروش) ہندوستان کا حساب جانتا تھا۔ وہ مجھے یہ حساب سکھانے اس کے پاس لے گئے۔ اسی زمانے میں

ایک عالم ابو عبد اللہ قاتلی آیا اس کے آنے سے پہلے میں نے فقہ میں بہت اچھی استعداد پیدا کر لی تھی۔ اب میں نے اس سے فلسفہ اور منطق کی کتابیں پڑھیں لیکن وہ ان کی باریکیاں مجھے نہیں سمجھا سکا اور میں نے خود اپنی کوشش اور رات دن کے مطالعے سے یہ چیز حاصل کی یہاں تک کہ میرا استاد جن مشکل مسئلوں کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ میں نے اُسے سمجھائے۔ پھر وہ یہاں سے دوسری جگہ چلا گیا اور میں اسی طرح فلسفے کی مشکل کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہا اور اللہ کی مہربانی سے علوم کے دروازے خود بخود مجھ پر کھلتے گئے۔ پھر میں نے طب کی طرف توجہ کی۔ یہ کوئی مشکل علم نہیں ہے میں نے طب کی کتابوں کا بغیر کسی کی مدد کے مطالعہ کیا اور تھوڑی مدت میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ بڑے فاضل اور مشہور طبیب مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ اب میں نے مطب بھی شروع کر دیا اس میں مجھے غیر معمولی کامیابی ہوئی میں اس وقت بھی علم فقہ کے مطالعہ میں برابر مصروف رہا۔ اس وقت میری عمر سولہ سال تھی اب میں نے اپنے مطالعے کی رفتار اور بڑھا دی منطق اور فلسفے کی کتابوں کو میں نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا اس زمانے میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں ایک دفعہ بھی پوری رات سویا ہوں، نہ دن میں سوائے مطالعہ کے کوئی دوسرا مشغلہ تھا، کسی مسئلہ کے سمجھنے میں دقت پیش آتی تھی اور کسی طرح حل نہ ہوتا تھا،

تو میں وضو کر کے جامع مسجد جاتا تھا اور نماز کے بعد دعا مانگتا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کی گرہ کھول دیتا تھا۔ رات کو چراغ سامنے رکھ کر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جاتا جب نیند کا غلبہ ہوتا اور کمزوری محسوس ہوتی تو پانی اور قوت پہنچانے والی چیزیں پی لیتا تھا اور پھر کام میں مشغول ہو جاتا اگر کبھی ہلکی سی نیند بھی آجاتی تو خواب میں بھی یہی مسائل آتے تھے اکثر خواب ہی میں بہت سے مسئلے حل ہو گئے۔

غرض اس طرح تمام علوم وفنون میں میں نے بہت مضبوط استعداد پیدا کر لی۔ ایک کتاب میری سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے اُسے چالیس دفعہ پڑھا اور وہ مجھے حفظ یاد ہو گئی۔ مگر سمجھ میں پھر بھی نہ آئی تو میں اُس کے سمجھنے سے مایوس ہو گیا ایک روز اتفاق سے ایک دن ایک کتب فروش کے یہاں گذر ہوا۔ اور وہاں بہت سستے داموں ایک کتاب مل گئی۔ یہ ابونصر فارابی کی تصنیف تھی اور اُس کتاب کی ایک طرح سے شرح تھی جو میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے اس شرح کی بدولت فوراً اس کتاب کو سمجھ لیا۔ اس سے مجھے بے اندازہ مسرت ہوئی۔ اور اس خوشی میں میں نے بہت سی خیرات کی۔ اس عرصہ میں میری شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ اتفاق سے ان ہی دنوں سلطان نوح بن منصور سامانی سخت بیمار ہوا۔ علاج کے سلسلے میں میرا بھی ذکر آیا۔ حکیموں نے

بادشاہ نے مجھے بلوانے کی درخواست کی۔ چنانچہ دوسرے حکیموں کے ساتھ میں بھی علاج کرنے لگا۔ اللہ نے اسے شفا دی اور میں اُس کی خدمت میں ملازم ہوگیا۔ اس کا کتب خانہ بہت قیمتی تھا میں نے اُس سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ اس وقت میری عمر ۱۸ سال تھی۔ اس عمر میں میں نے تمام علموں میں فراغت حاصل کرلی۔ میرے پڑوس میں ایک شخص عروضی تھا اس نے مجھ سے درخواست کی کہ اس فن (عروض) پر اُسے ایک کتاب لکھ دوں۔ میں نے اسے ایک کتاب لکھ دی اور اُسی کے نام پر منسوب کردی میرے پڑوس میں ایک بہت بڑے فقیہ بھی رہتے تھے انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اُن کی کتابوں کی شرح لکھ دوں چنانچہ میں نے الحاصل و المحصول کے نام سے بیس جلدوں میں ایک کتاب لکھی ان ہی کے لئے میں نے اخلاق کے علم میں بھی ایک کتاب لکھی۔ یہ دونوں کتابیں صرف ان ہی کے یہاں مل سکتی ہیں ۲۲ سال کی عمر میں میرے والد کا انتقال ہوگیا اور کچھ ایسی صورتیں پیش آئیں کہ میری مالی حالت خراب ہوگئی۔ میں نے کچھ دنوں نوح بن منصور کی حکومت میں ملازمت کی پھر ضرورتوں نے مجھے بخارا چھوڑنے اور کرکانج جانے پر مجبور کیا۔ یہاں سے میرے لئے اتنا وظیفہ مقرر ہوگیا کہ مجھ

یعنی عروض جاننے والا۔

جیسے شخص کی ضرورتوں کے لئے کچھ نہ کچھ کافی ہو جاتا تھا مگر ضرورتوں نے پھر مجھے پریشان کیا اور یہاں سے نکلنا پڑا۔ میں مختلف مقامات میں ٹھہرتا ہوا جرجان۔ شمس المعالی قاموس بن وشمگیر کے پاس جانا چاہتا تھا مگر اسی زمانے میں اُسے ایک لڑائی میں شکست ہوئی اور گرفتار کر لیا گیا یہاں سے میں دستان چلا گیا۔ لیکن وہاں سخت بیمار ہو گیا۔ کچھ اچھا ہوا تو پھر جرجان چلا آیا۔

جرجان میں ایک شخص ابو محمد شیرازی کو فلسفے سے بہت دلچسپی تھی اس نے شیخ کے لئے اپنے قریب ایک شاندار مکان بنوایا۔ اور اس میں شیخ کو بڑی عزت کے ساتھ ٹھہرایا۔ شیخ نے اس شخص کے لئے بہت سی کتابیں لکھیں۔ اپنی مشہور کتاب اوسط اُس نے یہیں لکھی۔ یہاں سے وہ رے گیا۔ رے سے قزوین قزوین سے ہمدان، ہمدان میں وہ شمس الدولہ کا وزیر ہو گیا۔ لیکن فوج نے مخالفت کی۔ اس کا گھر لوٹ لیا۔ تمام مال و اسباب تباہ و برباد کر دیا۔ خود اُسے گرفتار کر لیا اور شمس الدولہ سے درخواست کی کہ اسے قتل کر دیا جائے لیکن شمس الدولہ نے یہ درخواست نامنظور کی اور چھوڑ دیا۔ شیخ فوج کے ڈر سے چھپ کر کہیں نکل گیا۔ کچھ دنوں بعد شمس الدولہ قولنج کے درد میں مبتلا ہوا۔ اُس نے شیخ کو علاج کے لئے بلایا۔ اُس سے معذرت کی اور پھر وزیر بنا دیا۔ مگر جب شمس الدولہ کا انتقال ہو گیا اور اُس کے بیٹے تاج الدولہ

نے شیخ کو وزارت کا عہدہ نہیں دیا تو وہ اصفہان چلا گیا وہاں کا امیر علاؤالدولہ تھا اُس نے شیخ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔
شیخ ایک رصدگاہ بنوانا چاہتا تھا علاؤالدولہ سے منظوری بھی لے لی تھی مگر اُس کے بنوانے کی نوبت نہیں آئی۔ اصفہان میں اُسے قولنج کی بیماری ہوگئی جس سے بہت کمزور اور دبلا ہوگیا۔ ایک بار وہ علاؤالدولہ کے ساتھ سفر میں تھا کہ قولنج کا پھر دورہ ہوا مرض کے اس حملے نے اس کی حالت اور بھی خراب کردی اب وہ ایک ہفتہ کے لئے اچھا ہوجاتا تھا اور پھر بیمار پڑ جاتا تھا آخر صحت سے مایوس ہوگیا تو علاج چھوڑ دیا۔ غسل کرکے اپنے تمام گناہوں سے توبہ کی۔ اپنی تمام دولت غریبوں میں تقسیم کردی۔ اپنے غلام آزاد کردئے اور ہر تیسرے روز قرآن ختم کرنے لگا۔ آخر رمضان ۴۲۸ھ / ۱۰۳۶ء کو جمعہ کے دن ہمدان میں انتقال کیا۔ ۵۸ سال کی عمر پائی۔
شیخ کی تصانیف کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ فلسفہ اور طب کے علاوہ اُس نے دوسرے علوم و فنون پر بھی بے شمار کتابیں لکھی ہیں اور ہر ایک کتاب اپنے فن میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔
اس کے اتنے بڑے اور زبردست عالم ہونے کی وجہ صرف اس کی ذہانت ہی نہ تھی وہ محنتی بھی بہت تھا رات دن سوائے پڑھنے لکھنے کے اس کا کوئی مشغلہ ہی نہ تھا۔ جب کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی تو مایوس ہوکر اُسے

چھوڑ نہیں دیتا تھا بلکہ اُس کے پیچھے لگ جاتا تھا اور جب تک اُسے سمجھ نہیں لیتا تھا چین سے نہیں بیٹھتا تھا اس کی ایک کتاب پر لوگوں نے اعتراض کئے اور یہ اعتراض ایک رسالے کی صورت میں اس کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ یہ رسالہ اُس کے پاس شام کو آیا اور اُس نے رات بھر میں سو صفحوں میں اس کا جواب لکھ دیا۔ لوگوں کے پاس یہ جواب پہنچا تو حیران رہ گئے اسی طرح ایک بادشاہ کی مجلس میں ایک عالم نے اس کی ادبی قابلیت اور عربی دانی پر طنز کیا شیخ کو بہت غیرت آئی اور لگاتار تین برس تک محنت کرکے ادب میں کمال حاصل کر لیا یہی باتیں تھیں جن کی وجہ سے وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا تھا اور آج تک دنیا اُس کو شیخ الرئیس کے نام سے یاد کرتی ہے۔

شیخ کی کتابوں کی یورپ میں بہت قدر ہوئی۔ اب سے کئی سو برس پہلے اس کی بہت سی کتابوں کا یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہو گیا تھا۔ اس کی بہت سی کتابیں مصر کے خدیوی کتب خانہ اور یورپ کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

علامہ ابن حزم ظاہری

علامہ ابو محمد علی بن احمد ۳۸۴ھ، ۹۹۴ء میں شہر قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی ان کے باپ وزیر تھے۔ لیکن دولت و امیری کے نشے نے انھیں عیش و آرام کی طرف مائل نہیں کیا شروع ہی سے محنت کی عادت تھی خوب جی لگا کر پڑھا اور تھوڑے ہی دنوں میں منطق، فلسفہ، ادب اور شاعری میں فضیلت اور کمال کا درجہ حاصل کر لیا۔ ایک بار انھیں فقہی مسائل سے ناواقفیت کی وجہ سے بہت شرمندہ ہونا پڑا۔ اپنے استاد سے شہر کے مشہور فقیہ کا پتہ پوچھا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا اور اُن سے موطا امام مالک اور فقہ کی دوسری کتابیں پڑھیں اور تین سال میں اس علم کے ماہر ہو گئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے والد کی طرح یہ بھی وزیر ہو گئے لیکن وزارت کے کاموں سے ان کے علمی مشغلوں میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی

اس لئے اس عہدے سے علیحدگی اختیار کرلی اپنی وزارت اور ریاست کے زمانے میں خالص ریشمی لباس پہنتے تھے اور مرصع تخت و کرسی پر بیٹھتے تھے بعد میں یہ سب تکلفات چھوٹ گئے۔

علامہ ابن حزم پہلے شافعی تھے پھر ظاہری مذہب اختیار کرلیا آخر میں اسے بھی چھوڑ دیا اور اجتہاد کا دعویٰ کرنے لگے اور یہ دعویٰ صحیح بھی تھا مگر عام لوگ اور اس زمانے کے عالم اُن سے بددل اور مخالف ہوگئے بات یہ تھی کہ جو بات حق سمجھتے تھے اُسے برملا کہتے تھے اور نکتہ چینی کے وقت اگلوں یا پچھلوں کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے زمانے کے عالموں اور فقیہوں پر طرح طرح کے اعتراضات کئے اس کا نتیجہ ان کے حق میں بہت برا ہوا یہ تمام عالم ان کے مخالف ہوگئے ان کے رد میں کتابیں لکھیں بادشاہوں کو سمجھایا کہ یہ ایک خطرناک فتنہ ہے اور عام لوگوں کو ان سے ملنے جلنے سے روکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں گئے وہاں سے نکالے گئے آخر ایک معمولی سے گاؤں میں پناہ لینا پڑی اور وہیں ۴۵۶ھ میں اتوار کے دن انتقال کیا ایک عالم کا قول ہے کہ "ابن حزم کی تیغ زبان اور حجاج بن یوسف کی تیغ بےنیام دونوں بہنیں ہیں"

علمار کے خوف سے کسی شریف آدمی کو ان کے پاس آنے کی جرأت نہیں تھی البتہ چند معمولی درجے کے طالب علم اُن سے

پڑھتے تھے علامہ ابن حزم انھیں بڑی محنت سے پڑھاتے تھے

ان کی بعض تصانیف کو ان کی زندگی میں گھر سے باہر نکلنا نصیب نہ ہوا جو کتابیں بازار میں آجاتی تھیں وہ علما کے اشارے سے یا تو پھاڑ دی جاتی تھیں یا جلادی جاتی تھیں۔

علامہ ابن حزم کو تمام اسلامی علوم تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام وغیرہ میں مہارت حاصل تھی۔ منطق اور فلسفے کے امام تھے۔ ادب شاعری اور فصاحت وبلاغت میں پوری دستگاہ تھی۔ شعر فی البدیہ کہتے تھے اندلس کے ایک بہت بڑے عالم ابن بشکوال کا قول ہے کہ ابن حزم نے تمام اسلامی اور غیر اسلامی علوم میں مہارت حاصل کی تھی اس حیثیت سے اندلس کا کوئی عالم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تصانیف کی تعداد خود ان کے بیٹے کے بیان کے مطابق چارسو ہے جو اسّی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ان میں سے بعض تصنیفیں بہت اہم ہیں اور اب تک پائی جاتی ہیں بہت متواضع اور عالم باعمل تھے اکثر علما کا خیال ہے کہ علامہ ابن حزم کے زمانے کے علما اور عام مسلمانوں کی ان سے مخالفت صحیح علم سے ناواقفیت کی بنا پر تھی۔

نظام الملک طوسی

نظام الملک طوسی ۴۰۸ھ/۱۰۱۸ء میں طوس کے علاقے میں ایک غریب کسان (علی بن اسحٰق) کے گھر پیدا ہوا۔ ابھی دودھ پیتا تھا کہ ماں کا انتقال ہوگیا۔ یہ ہونہار بچہ ننھے پن سے بڑا ذہین اور ہوشیار تھا سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ پھر اُس زمانے کے دوسرے علوم و فنون میں کمال پیدا کیا۔ پڑھ لکھ کر فارغ ہوا تو روزگار کی تلاش میں نکلا۔ اور جگہ جگہ کی ملازمتیں کرتا الپ ارسلان سلجوقی کے پاس پہنچا۔ وہاں اُس کے جوہر کھلے اس نے اپنی کارگذاریوں سے بادشاہ کو بہت خوش کیا اور اس نے نظام الملک کو اپنا وزیر بنالیا۔ نظام الملک نے بڑی دانائی اور دور اندیشی سے یہ خدمت انجام دی اس کی وزارت کے دسویں سال الپ ارسلان کا انتقال ہوگیا اور اسی کی کوششوں سے بادشاہت اس کے بڑے بیٹے ملک شاہ سلجوقی کو ملی، ملک شاہ نے اس صلے میں اس پر اور بھی مہربانی کی اور کل

سفید و سیاہ کا مالک بنا دیا اس زمانے کا عباسی خلیفہ مقتدر باللہ بھی نظام الملک کے علم و فضل اور تدبر و قابلیت کی وجہ سے اس کی بہت عزت کرتا تھا۔

ملک شاہ کے عہد میں اس نے کامل تیس ۳۰ سال تک نہایت شان و شوکت اور کامیابی کے ساتھ وزارت کی آخر ۴۸۵ھ ۱۰۹۲ء میں حسن[۵] بن صباح کے ایک مرید (باطنی) نے دھوکے سے اُسے قتل کر دیا یہ ایک ایسا نقصان تھا جسے امیر و غریب، بوڑھے، بچے، بادشاہ وزیر سب نے شدت سے محسوس کیا کیونکہ اُس نے اپنی زندگی میں جو اچھے اچھے کام کئے تھے اُن سے سب ہی کو فائدہ پہنچ رہا تھا

نظام الملک قلم اور تلوار دونوں کا دھنی تھا۔ ملک شاہ کو سلطنت اُسی کی بدولت ملی اور اس کی سلطنت کو اتنی وسعت اور ترقی بڑی حد تک اسی کی بدولت حاصل ہوئی۔ ملک کی علمی تعلیمی و تمدنی ترقیوں میں اسی کا ہاتھ تھا۔ لڑائی کے نقشے

---

۵ کہتے ہیں حسن بن صباح نظام الملک کا ساتھی اور دوست تھا۔ نظام الملک نے اس کے ساتھ سلوک بھی کیا۔ مگر اس نے ایک عجیب و غریب مذہب ایجاد کیا تھا۔ یہ باطنی مذہب کہلایا جاتا تھا۔ اس مذہب کے ماننے والوں نے بہت فتنہ پھیلا رکھا تھا۔ نظام الملک اس مذہب کا مخالف تھا اور اس فتنے کو دبانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہی مخالفت اس کے قتل کا سبب بنی۔

وہ بناتا تھا سیاست کی گتھیاں وہ سلجھاتا تھا مدرسے وہ قائم کرتا تھا اُس نے حکومت کے پورے علاقے میں مدرسوں کا جال بچھا دیا تھا۔ مدرسہ نظامیہ بغداد اس کا خاص کارنامہ ہے جس کی حیثیت اس زمانہ کی یونیورسٹی کی تھی اس مدرسے کی صرف عمارت لاکھوں روپیہ کے خرچ سے دو برس میں تیار ہوئی۔ سلطنت کی طرف سے کئی لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی اُس کے خرچ کے لئے وقف کی گئی۔ پڑھانے کے لئے اس زمانے کے بہترین عالم بلوائے گئے۔ لڑکوں کے رہنے کے لئے بورڈنگ کا بھی انتظام کیا گیا۔ اور ایک کتب خانہ بھی بہت بڑے پیمانے پر قائم کیا گیا۔ تمام طالب علموں کو حکومت کی جانب سے وظیفے دئے جاتے تھے۔

نظام الملک کو رعایا کے آرام و آسائش کا بھی بہت خیال رہتا تھا اس کے زمانے میں زراعت کی ترقی کے لئے نہریں کھدوائی گئیں شہروں کی حفاظت کے لئے شہر پناہ اور فصیلیں تیار ہوئیں راستوں پر مسافروں کے ٹھیرنے کے لئے سرائیں بنیں تجارت کی ترقی کے لئے چنگی موقوف کی گئی مختلف شہروں میں عمدہ عمدہ باغ لگوائے گئے اور شفا خانے قائم ہوئے۔

نظام الملک علما کا بہت احترام کرتا تھا اولیاء اللہ اور بزرگوں سے بھی بہت عقیدت تھی۔ ہر وقت باوضو رہتا تھا قرآن ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور تلاوت کرتے وقت ادب کے خیال سے ٹیک نہیں لگاتا

تھا۔ اذان کی آواز سنتے ہی سب کام بند کر دیتا تھا۔ جمعہ اور پیر کو روزہ رکھتا تھا۔ اتنی مذہبیت کے باوجود تعصب نام کو نہ تھا کسی دوسرے مذہب کی دل آزاری کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس کی مذہبی خدمات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس نے تمام آبادیوں میں جگہ جگہ مسجدیں بنوائیں۔ حاجیوں کی آسانی کے لئے حج کا راستہ درست کرایا۔ راستے میں جگہ جگہ حوض بنوائے۔ اور حرمین (مکہ۔ مدینہ) کی بہت کچھ خدمت کی۔ بڑا منصف مزاج تھا۔ فریادیوں کو بلا روک ٹوک اس کے پاس آنے کی اجازت تھی۔ اہلکاروں کی طرف سے اس معاملے میں ذرا بھی تساہل ہوتا تو سخت ناراض ہوتا۔ بڑا رحم دل اور غریب پرور تھا۔ مسکینوں اور فقیروں کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتا تھا۔ ایک دفعہ اس کے دستر خوان پر ایک غریب آدمی بیٹھا تھا اس کا داہنا ہاتھ کٹا ہوا تھا اُلٹے ہاتھ سے کھا رہا تھا پاس ہی ایک امیر بیٹھا تھا اُسے کراہت معلوم ہوئی نظام الملک تاڑ گیا، اور اُس آدمی سے کہنے لگا میاں یہ بڑے آدمی ہیں انھیں تمھارے پاس بیٹھتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے تم میرے پاس چلے آؤ۔ سخاوت و فیاضی میں بھی وہ آپ ہی اپنی نظیر تھا۔ علاوہ اُن بے شمار خیرات و صدقات کے جو وقتاً فوقتاً کرتا رہتا تھا سو دینار روز خیرات کرتا تھا۔

ملک شاہ سلجوقی

سلجوقی خاندان جس کا بانی سلجوق نام ایک ترک امیر ہے۔ مسلمان بادشاہوں کا ایک مشہور خاندان گزرا ہے۔ اس کی حکومت خراسان سے شروع ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں میں چین کے اس سرے سے ایران و عراق ہو کر قسطنطنیہ کی دیوار تک پھیل گئی۔ اس خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ ملک شاہ سلجوقی گذرا ہے جو ملک الپ ارسلاں کے شہید ہونے کے بعد تخت پر بیٹھا۔ یہ ۴۴۷ھ / ۱۰۵۵ء میں پیدا ہوا بہت خوبصورت اور وجیہ تھا فوجی کرتبوں۔ شہ سواری اور چوگان بازی میں مہارت تھی۔ عقل، تدبر، سوجھ بوجھ، دلیری، بہادری، انصاف پسندی فراخ دلی اور سخاوت غرض ایک کامیاب حکمراں کی تمام خصوصیات اس میں موجود تھیں۔ اُسے بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں کبھی تو دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے اور کبھی خود

اپنے ملک کی بغاوتیں دور کرنے کے لئے۔ ان لڑائیوں میں فتح اکثر و بیشتر اسی کے ہاتھ رہی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ بغداد کا خلیفہ مقتدر باللہ اُس سے سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔ روم کا بادشاہ قسطنطین اُسے خراج دیتا تھا۔ اور خاقان چین (چین کا شہنشاہ) اپنے سکے پر اُس کا نام کھدواتا تھا۔

اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو بادشاہ ملک فتح کرنے کی دھن میں رہتے ہیں اُنھیں ملک کے انتظام کی فکر ہوتی ہے نہ اس کا سلیقہ۔ لیکن ملک شاہ سلجوقی میں یہ دونوں وصف موجود تھے اس نے ایک طرف بہت سے ملک فتح کئے اور بڑے بڑے زبردست بادشاہوں کو نیچا دکھایا تو دوسری طرف ان فتح کئے ہوئے ملکوں کی ترقی کے لئے بھی بڑے بڑے کام کئے۔ سڑکیں ٹھیک کرائیں۔ دریاؤں پر پل بنوائے۔ جگہ جگہ نہریں کھدوائیں جو نہریں پٹ گئی تھیں انھیں صاف کرایا۔ قافلوں کے ٹھہرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرائیں بنوائیں۔ تالاب کھدوائے۔ بند بنوائے۔ مسجدیں تعمیر کرائیں اور مریضوں کے لئے شفا خانے کھلوائے۔ اس کی خوش قسمتی سے اُسے وزیر بھی نظام الملک جیسا شخص مل گیا تھا۔ نظام الملک کو تعلیم کی ترقی کا بہت خیال تھا۔ اس نے حکومت کے تمام بڑے شہروں میں مدرسے قائم کرائے اور

کتب خانے کھلوائے۔

ملک شاہ سلجوقی کی انصاف پسندی بھی مشہور ہے۔ لوگ اُسے الملک العادل یا منصف مزاج بادشاہ کہتے تھے۔ ہر شخص کے لئے انصاف کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ہر کوئی بلا روک ٹوک اپنی شکایتیں پیش کر سکتا تھا۔ اپنی رعایا کی بہبودی سہولت اور آرام کا اُسے ہر وقت خیال تھا اُس نے تاجروں سے چنگی لینے کا رواج موقوف کر دیا۔ مکے میں وہاں کا امیر اپنی خدمت کے صلے میں جو کچھ وصول کرتا تھا وہ بھی حکماً موقوف کر دیا اور اُس کے گذارے کے لئے جاگیر وقف کر دی۔ علاوہ اس کے مکہ کے بدوؤں اور حرم شریف کے نوکروں کے وظیفے مقرر کئے۔ انھیں اچھائیوں کی وجہ سے اس کی سلطنت اتنی کامیاب رہی اور اپنے زمانے اور اپنے خاندان کے سب سے کامیاب بادشاہوں میں سمجھا جاتا ہے۔

اس نیک نام بادشاہ نے بغداد میں ۴۸۵ھ / ۱۰۹۵ء میں انتقال کیا۔ ۳۸ سال عمر پائی اور بیس سال حکومت کی۔

جاراللہ زمخشری

ان کا پورا نام ابوالقاسم محمد بن عمرو بن محمد بن عمر الزمخشری ہے ۴۶۶ یا ۴۶۷ھ ۱۰۷۴ یا ۱۰۷۵ء میں زمخشر میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم کی غرض سے ملکوں ملکوں کا سفر کیا۔ عرصہ دراز تک مکہ معظمہ میں قیام رہا اسی وجہ سے جاراللہ (اللہ کے پڑوسی) کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

ایک بار خوارزم کے ملک میں سفر کر رہے تھے سردی کی شدت تھی برف بھی گر رہی تھی اس سے ان کے پیر میں کچھ بیماری پیدا ہو گئی اور یہاں تک بڑھی کہ پیر کٹوانا پڑا۔

زمخشری نے یہ تمام مصیبتیں محض علمی جستجو کی خاطر اٹھائیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جو شخص بھی کسی بات میں کامیاب ہونا چاہتا ہے وہ پہلے طرح طرح کی آزمائشوں سے گذرتا ہے تب پھل پاتا ہے۔ زمخشری کو بھی ان آزمائشوں سے دو چار ہونا پڑا مگر وہ اپنی دُھن میں لگے رہے اور تھوڑے ہی دنوں میں

انھوں نے اکثر علوم و فنون میں کمال حاصل کر لیا خصوصاً تفسیر، حدیث، لغت، نحو، اور علم بیان میں اپنے زمانے کے امام تھے۔ لوگ دور دور سے یہ علوم و فنون سیکھنے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ ان کی تصنیفات بہت بلند پایہ ہیں خصوصاً تفسیر الکشاف عن حقیقۃ التنزیل اکثر بڑے بڑے علما کا خیال ہے کہ یہ اپنے طرز کی بہترین کتاب ہے کوئی کتاب اب تک اس خاص طرز میں اس سے بہتر نہیں لکھی گئی بہت بڑے بڑے عالموں نے اس کی شرح اور حاشیے (فٹ نوٹ) لکھے ہیں کتاب کشف الظنون نے ان سب لوگوں کی تفصیل دی ہے جو پانچ صفحوں میں آئی ہے یہ تفسیر ہندوستان اور مصر میں کئی بار چھپ چکی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے زبان، ادب، فصاحت و بلاغت لغت اور نحو میں بھی بہت اچھی کتابیں لکھی ہیں ان میں سے کچھ مصر اور یورپ کے عالموں کی کوششوں سے چھپ گئی ہیں۔ کچھ یورپ مصر اور ترکی کے قلمی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ زمخشری کو شاعری میں بھی دخل تھا ابن خلکان نے بہت سے شعر نقل کئے ہیں ۵۳۸ھ ۱۱۴۳ء میں جرجان میں انتقال کیا۔

امام غزالیؒ

امام غزالیؒ

امام حجۃ الاسلام محمد بن محمد بن احمد ۴۵۰ھ ۱۰۵۸ء میں طاہران میں پیدا ہوئے ان کے باپ سوت کات کر بیچتے تھے۔ سوت کو عربی میں غزل کہتے ہیں اسی لئے یہ غزالی (سوت والے) مشہور ہو گئے یہ بے پڑھے تھے اور اس کا انھیں افسوس تھا۔ جب موت کا وقت قریب آیا تو امام صاحب اور اُن کے چھوٹے بھائی کو اپنے ایک صوفی دوست کے سپرد کر دیا اور وصیت کی کہ مجھے اپنے جاہل رہ جانے کا افسوس ہے۔ کاش میرے یہ دونوں بچے پڑھ لکھ جاتے میں جو کچھ روپیہ پیسہ چھوڑے جاتا ہوں ان کی تعلیم پر خرچ کر دینا۔

امام صاحب نے پہلے اپنے شہر میں پڑھا۔ اس کے بعد قصبۂ جرجان میں گئے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق استاد جو کچھ پڑھاتا تھا امام صاحب اُسے لکھ لیتے تھے۔ ایک بار یہ اپنے مکان جا رہے

تھے راستے میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ سامان میں ان کی کاپیاں بھی تھیں۔ امام صاحب کو سب سے زیادہ ان ہی کے چھن جانے کا صدمہ تھا آخر صبر نہ ہو سکا تو ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے۔ اور اس سے کہا "سب سامان رکھ لو مگر وہ کاپیاں واپس کر دو"۔ سردار ہنس پڑا اور کہنے لگا "بس یہی تمھارا علم ہے کہ کاغذ کھو گیا تو تم کورے رہ گئے" یہ کہہ کر اس نے کاپیاں واپس کر دیں۔ ڈاکو کی بات امام صاحب کے دل میں تیر کی طرح لگی۔ گھر پہنچ کر انھوں نے یہ تمام کاپیاں تین سال میں حفظ کر ڈالیں۔

امام صاحب کا علم اب بہت بڑھ گیا تھا اس لئے انھوں نے بجائے معمولی استادوں سے پڑھنے کے مدرسہ نظامیہ نیشاپور کی راہ لی جو اس زمانے کا سب سے اچھا اور سب سے مشہور مدرسہ تھا وہاں انھوں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی ان کے استاد علامہ امام الحرمین کو جو اس مدرسے کے سب سے بڑے مدرس تھے اپنے اس شاگرد پر بہت ناز تھا۔

تعلیم سے فارغ ہو گئے تو کچھ عرصے کے بعد اسی مدرسہ (نظامیہ نیشاپور) کے صدر مدرس بنا دیئے گئے۔ اس زمانے میں ان کی عمر صرف ۳۴ سال تھی اتنی کم سنی میں یہ عزت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے بڑے بڑے عالموں کو یہ عہدہ حاصل کرنے کی آرزوئیں تھیں۔

امام صاحب نے اسلام کے تمام علموں میں مہارت حاصل کی اور ہر فرقے کی کتابیں پڑھیں اور ان پر گہری نظر ڈالی لیکن تصوف نے ان پر سب سے زیادہ اثر کیا۔ ایک بات اُن کے سامنے بار بار آتی تھی اور وہ یہ کہ اس وقت وہ جن مشغلوں میں گھرے ہوئے ہیں وہ خالص اسلامی ہیں لیکن ان میں اتنا خلوص نہیں ہے اور تصوف سرتاپا خلوص ہے۔ مگر یہ علمی سے زیادہ عملی چیز ہے اور بغیر عبادت اور ریاضت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اپنے لئے یہی راہ سب سے بہتر سمجھی اور تمام مشغلے چھوڑ کر سفر کا ارادہ کیا۔ لوگوں کو اس آزادی کی خبر ہوئی تو بڑے اسرار اور عاجزی کے ساتھ اس ارادے سے باز آجانے اور اس عہدے کو نہ چھوڑنے کی درخواست کی۔ مگر یہ اپنے ارادے میں مستقل رہے اور عیش و آرام، عزت و دولت کے تمام سامانوں پر لات مار کر دمشق کی طرف سدھارے۔ دمشق میں دو برس تک رات دن عبادت کی اور صوفیوں کے طریقے پر چلّے کھینچے۔ یہاں سے بیت المقدس تشریف لے گئے۔ وہاں کچھ دنوں رہنے کے بعد حج کے لئے مکے اور پھر مدینے تشریف لے گئے۔ مدینے میں ایک مدت تک قیام رہا پھر مصر گئے مصر سے اندلس جانا چاہتے تھے مگر بعض اسباب ایسے پیش آئے کہ نہ جا سکے۔

آخر برابر دس برس تک عبادت اور ریاضت کے بعد

انھوں نے اس زمانے کے صوفیوں میں بہت بڑا مرتبہ حاصل کر لیا اب وہ تنہائی کی زندگی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ مگر اس وقت مسلمانوں میں طرح طرح کی خرابیاں پھیل رہی تھیں اور اسلام کو اس سے بڑا صدمہ پہنچ رہا تھا امام صاحب ان خرابیوں کو برداشت نہ کر سکے اور مجبوراً انھیں تنہائی سے نکلنا پڑا ادھر حکومت کی طرف سے بھی برابر اصرار تھا کہ مدرسہ نظامیہ کی مدرسی قبول کر لیں۔ چنانچہ امام صاحب اپنے پچھلے عہدے پر تشریف لے آئے اور پہلے کی طرح پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔

تھوڑے دنوں کے بعد پھر اس منصب کو چھوڑ دیا اور اپنے وطن جا کر ایک مدرسے اور ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ اس عرصے میں ایک بار اور مدرسہ نظامیہ کی مدرسی کے لئے آپ پر زور ڈالا گیا مگر آپ نے منظور نہیں کیا۔

امام صاحب نے ۱۴ رجمادی الثانی ۵۰۵ھ ۱۱۱۱ء میں انتقال کیا۔ انتقال کا واقعہ بھی بہت حیرت انگیز ہے۔ ایک دن صبح کی نماز سے فارغ ہو کر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا "جو اپنے مولا کا حکم" اور پیر پھیلا دئے دیکھا گیا تو روح نکل چکی تھی۔ آپ کے انتقال پر مسلمانوں میں عام طور سے ماتم کیا گیا اور بے شمار مرثیے لکھے گئے۔

امام صاحب نے تصوف۔ فقہ، حدیث، تفسیر، فلسفہ، منطق، علم کلام، غرض تمام علموں میں بہت اعلیٰ پائے کی کتابیں لکھی ہیں

عالموں اور عام مسلمانوں میں ان کی کتابوں نے بہت ہی مقبولیت حاصل کی۔ ان کی صرف ایک کتاب کی لوگوں نے ستر شرحیں لکھی ہیں۔ یورپ کی زبانوں میں بھی ان کی بعض کتابوں کا ترجمہ ہو گیا ہے

حضرت عبدالقادر جیلانی

حضرت محی الدین ابو محمد بن ابی صالح زنگی دوست ۴۷۱ھ / ۱۰۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ صوفیوں کا مشہور قادری فرقہ ان ہی سے نکلا ہے۔ ان کے نسب کا سلسلہ عام طور پر حضرت امام حسن علیہ السلام سے ملایا جاتا ہے۔ لیکن ان کے باپ کا نام اہل عجم (غیر عرب) کا سا ہے۔ بغداد میں بھی انھیں عجمی پکارا جاتا تھا۔ جس گاؤں میں پیدا ہوئے اس کا نام نیف ہے جو گیلان کے علاقے میں ہے۔

۱۸ سال کی عمر میں پڑھنے کے لئے بغداد بھیجے گئے۔ پڑھنے لکھنے کا تمام خرچ آپ کی ماں برداشت کرتی تھیں۔ بغداد میں آپ نے سب سے پہلے وہاں کے مشہور ادیب تبریزی سے ادب اور زبان سیکھی۔ پھر حنبلی فقہ اور دوسرے علموں کی طرف توجہ کی اور کمال حاصل کیا۔

۴۸۸ھ / ۱۰۹۵ء سے ۵۲۱ھ / ۱۱۲۷ء تک کے حالات کا پتہ نہیں چلتا سوائے

اس سے کہ اس زمانے میں انھوں نے مختلف مقامات کا سفر کیا ہے۔ شادی کی اور ۵۰۸ھ ، ۱۱۱۴ء میں ایک بچہ پیدا ہوا وہ امام ابو حنیفہؒ کے مزار کے منتظم اور متولی بھی تھے۔

تصوف کا علم انھوں نے اُس زمانے کے مشہور صوفی حضرت ابوالخیر محمدؒ بن مسلم سے سیکھا اور اپنے پیر سے اجازت لے کر وعظ ونصیحت کا کام شروع کر دیا آہستہ آہستہ مریدوں اور معتقدوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ بغداد میں اُن کے لئے ایک خانقاہ بنوائی گئی۔ بعد میں عام مسلمانوں نے بغداد کے ایک مدرسے کی عمارت کو اور بڑھا کر شیخ صاحب کو وہاں ٹھہرایا۔ وہ تصوف اور روحانیت کے علاوہ فقہ، حدیث اور نحو بھی پڑھاتے تھے اور فتوے بھی دیتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں سے اکثر بڑے بڑے بزرگ صوفی اور عالم ہوئے ہیں۔ ان کے وعظ اور نصیحت میں بہت اثر اور بڑی برکت تھی بہت سے یہودی اور عیسائی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ علاوہ اس کے انھوں نے عام مسلمانوں کی بہت کچھ اصلاح کی۔

اُنھوں نے فقہ اور تصوف پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے بعض اب تک پڑھائی جاتی ہیں

حضرت کے ایک شاگرد اور مرید ابوالفتح ہروی جو ۴۰ سال تک اُن کی خدمت میں رہے ہیں بیان کرتے ہیں کہ حضرت شیخ

ہمیشہ با وضو رہتے تھے۔ اکثر صبح اور عشاء کی نماز ایک ہی وضو سے پڑھتے تھے۔ رات کا اکثر حصہ عبادت میں گذرتا تھا اور اُس وقت اُن کے پاس کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار بغداد کا خلیفہ اُن سے ملنے آیا مگر اُسے بھی اجازت نہیں ملی۔

باوجود اس قدر عزت اور شان کے معمولی سے معمولی لوگوں سے نہایت بے تکلفی سے ملتے تھے۔ غریبوں اور محتاجوں کی ہمیشہ خبر لیتے رہتے تھے۔ ان کے لئے کھانا کپڑا اور ضرورت کی دوسری چیزیں مہیا کرتے تھے۔ رئیسوں اور امیروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کبھی کسی بادشاہ امیر یا رئیس کے دروازے پر نہیں گئے۔ یہ لوگ خود خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور حضرت شیخ کبھی ملتے تھے۔ کبھی انکار کر دیتے تھے۔

حضرت شیخ نے ۵۶۱ھ میں اس دنیا سے کوچ کیا کل نوے سال کی عمر پائی۔ زندگی ہی میں مریدوں اور معتقدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی اور انتقال کے بعد سے اب تک کروڑوں مسلمان آپ کو مانتے چلے آئے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو خصوصاً آپ سے بہت عقیدت ہے یہاں آپ "حضرت بڑے پیر صاحب" کے نام سے مشہور ہیں۔ چاند کے مہینے کی ہر گیارہ تاریخ کو آپ کے نام پر نیاز دلائی جاتی ہے۔ اور گیارہویں کہلاتی ہے۔

ابن رشد

محمد بن احمد بن محمد بن رشد ۵۲۰ھ ۱۱۲۶ء میں پیدا ہوا۔ یہ قرطبہ (اسپین) کے بہت بڑے علمی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا دادا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) اور باپ قاضی (جج) تھا۔ ابن رشد کی پرورش اسی علمی ماحول میں ہوئی۔ پہلے قرآن اور پھر امام مالکؒ کی مشہور کتاب "موطا" حفظ کی، اس کے بعد حدیث، فقہ اور عربی ادب کی تعلیم حاصل کی علم طب اس زمانے کے مشہور عالموں اور طبیبوں سے سیکھا۔ اس وقت اندلس میں فلسفہ کا چرچا ہو چلا تھا اور اُس نے جن عالموں سے تعلیم حاصل کی اُن میں سے بعض اس علم کے ماہر تھے اس لئے ابن رشد کو شروع ہی سے فلسفہ کا شوق پیدا ہو گیا۔ اُس نے بہت محنت اور دلچسپی سے اس علم کو سیکھا۔

قاضی کا عہدہ باپ دادا سے خاندان میں چلا آتا تھا ابن رشد کو بھی آسانی سے مل گیا۔ اس نے اس عہدے کے فرائض اس

خوبی سے ادا کئے کہ تمام ملک میں اس کی شہرت ہوگئی۔ اس عہد کے بادشاہ عبدالمومن کو ابن رشد کا حال معلوم ہوا تو اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا اور قاضی کا عہدہ بھی برقرار رکھا۔ اور ۵۴۸ھ ۱۱۵۸ء میں جب اُس کی عمر صرف ۲۰ سال تھی اسے تمام ملک کا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بنا دیا۔

عبدالمومن کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا یوسف اس کا جانشین ہوا یہ بڑا باجبروت بادشاہ تھا۔ کئی بار عیسائیوں پر چڑھائی کی اور انھیں سخت شکستیں دیں یہ بہت عالم و فاضل اور علم دوست بھی تھا۔ فلسفہ و حکمت سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ اور اپنے دربار میں بڑے بڑے فلسفیوں کو جمع کیا تھا۔ ابن رشد کی اس نے خاص طور پر قدر کی اسی بادشاہ کے مشہور عالم اور مصاحب ابن طفیل کی فرمائش پر ابن رشد نے ارسطو کے فلسفے کی شرح لکھی۔

۵۸۰ھ میں یوسف کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور اس کا بیٹا یعقوب منصور تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے باپ سے بھی زیادہ ابن رشد کی عزت کی۔ بلکہ ایک دفعہ تو اُسے دربار میں خاص اپنے پہلو میں جگہ دی۔ اس کے دوستوں نے اس انتہائی عزت پر اُسے مبارکباد دی۔ مگر خود اس سمجھ دار فلسفی کو بجائے خوشی کے رنج ہوا وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس طرح ایکا ایکی اور اتنی جلد اس قدر عزت افزائی کا نتیجہ برا ہوگا اور ایسا ہی ہوا بھی بہت جلد ایسے حالات پیدا ہوگئے

کہ ابن رشد کا ستارہ گردش میں آگیا اور اُسے بڑی ذلت نصیب ہوئی۔ وہ بادشاہ سے ملاقات یا بحث کے موقع پر اُس سے یا اخی (میرے بھائی) کہہ کر مخاطب ہوتا تھا علاوہ اس کے اپنی ایک تصنیف میں اُس نے بادشاہ کو صرف بربر کا بادشاہ لکھ دیا اور یہ گویا بادشاہ کی توہین تھی۔ پھر فلسفی کی حیثیت سے جوں جوں اُس کی شہرت میں اضافہ ہوا لوگوں میں اُس کے خلاف مخالفت کے جذبات بڑھتے گئے کیونکہ عام لوگ فلسفہ کو مذہب کے مخالف سمجھتے تھے اُس سے حسد کرنے والوں اور دشمنوں نے اس آگ کو اور بھی بھڑکایا۔ غرض بادشاہ نے قرطبہ میں ایک عام جلسہ کیا۔ اس میں ابن رشد اور اُس کے شاگردوں کو بھی بلایا اس جلسے میں مذہبی عالموں نے اس پر کفر اور الحاد کا فتویٰ لگایا۔ بادشاہ نے اُسے یہ سزا دی کہ یہودیوں کے ایک شہر میں جلا وطن کر دیا۔ نیز فلسفے کی کتابیں جلانے اور فلسفہ کے طالب علموں کو سزا دینے کا عام حکم دے دیا۔ اس زمانے میں ابن رشد نے بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔ عام لوگوں نے اُسے طرح طرح کی تکلیفیں دیں ایک دفعہ مسجد میں نماز پڑھنے گیا اس کا بیٹا بھی اُس کے ساتھ تھا۔ مگر چند بازاری لوگوں نے شور مچا کر اُسے باہر نکال دیا۔

کچھ عرصے کے بعد لوگوں کا جوش ٹھنڈا ہوا تو چند معزز لوگوں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ابن رشد کی سفارش کی اور کہا

کہ اس پر جو الزامات لگائے گئے ہیں غلط ہیں۔ بادشاہ بھی اُسے بلانا چاہتا تھا اس لئے اُس نے سفارش قبول کی۔ پہلے کی طرح دربار میں جگہ دی اور بہت عزت سے رکھا۔ مگر اب اس عیش و آرام کی زندگی سے فائدہ اُٹھانا اس کی قسمت میں نہ تھا مراکش پہنچ کر وہ بیمار پڑ گیا اور ۵۹۵ھ ۱۱۹۸ء میں انتقال کیا۔

ابن رشد بہت منکسر مزاج، متواضع، بااخلاق ارحم دل اور ہمدرد تھا۔ جب تک قاضی رہا کسی کے قتل کا فتویٰ نہیں دیا جب کبھی ایسی صورت پیش آجاتی کسی دوسرے کو اپنا قائم مقام بنا دیتا اسی طرح بے انتہا حلیم و بردبار تھا۔ لوگ اُس کے منہ پر اُسے بُرا کہتے مگر وہ کچھ نہ کہتا۔ ایک شخص نے اسے اس کے سامنے گالیاں دیں مگر اس نے بجائے سزا دینے کے انعام دیا اور نصیحت کی کہ کسی دوسرے شخص سے ایسا سلوک نہ کر بیٹھنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ سخاوت اور کنبہ پروری کی یہ حالت تھی کہ سرکاری عہدے سے جو کچھ ملتا سب اپنے عزیزوں اور ہم وطنوں پر صرف کر دیتا تھا۔ دوست تو دوست دشمن بھی اس کی دولت سے فائدہ اُٹھاتے تھے وہ خود کہتا تھا کہ دوستوں اور عزیزوں کو دینے کو تو خود میرا دل چاہتا ہے بات تو جب ہے کہ دشمنوں کے ساتھ سلوک کروں اپنے وطن سے بھی بہت محبت تھی اس کی تعریف میں اُس نے بہت کچھ لکھا ہے مطالعے کا بے انتہا شوق تھا۔ ساری عمر

میں صرف دو راتوں میں مطالعہ نہ کر سکا ایک شادی کی رات اور ایک اُس رات کو جب اُس کے باپ کا انتقال ہوا۔

ابن رشد مختلف علوم و فنون، مثلاً فقہ، طب اور فلسفہ وغیرہ میں ماہر تھا اس کی تصانیف تقریباً دس ہزار صفحوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں فقہ، طب اور فلسفہ کی کتابوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کی فلسفہ کی کتابوں نے مسلمانوں سے زیادہ یورپ میں مقبولیت حاصل کی۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ ہر حیثیت سے ابن سینا اور فارابی کا ہم سر بلکہ اُن سے بڑھ کر تھا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی

سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس ۵۳۲ھ/۱۱۳۸ء میں قلعہ تکریت میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اس قلعے کا حاکم تھا۔ کچھ دنوں بعد باپ اور چچا اسد الدین شیر کوہ، عماد الدین زنگی کے پاس چلے آئے۔ عماد الدین نے، اور اُس کی شہادت کے بعد اُس کے بیٹے نور الدین زنگی نے اس خاندان کی بڑی عزت کی اور اسد الدین شیر کوہ کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنا دیا۔

اسد الدین شیر کوہ کو مصر کی مہم پر کئی بار جانا پڑا۔ اس کا بھتیجا صلاح الدین بھی اُس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور اپنے چچا کے ساتھ مل کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیتا تھا آخر میں شیر کوہ مصری حکومت کا وزیر ہو گیا اور جب تھوڑے دنوں بعد اُس کا انتقال ہوا تو یہی ہونہار نوجوان اُس کا جانشین بنا۔ اس عہدے کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہی اس نے ایسی محنت اور تن دہی سے کام کیا کہ

بہت تھوڑے عرصے میں مصر کی حالت کچھ سے کچھ ہوگئی۔

اس زمانے میں عیسائیوں یا فرنگیوں کا بڑا زور تھا۔ مسلمانوں کی حکومت کمزور ہو جانے سے انھوں نے بہت سے اسلامی ملکوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ حتیٰ کہ بیت المقدس بھی ان ہی کے پاس تھا۔ یہی نہیں دوسرے اسلامی ملکوں پر بھی اُن کا دانت تھا۔ اور آئے دن وہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چڑھائی کرتے رہتے تھے۔

صلاح الدین کے آقا نور الدین زنگی نے اپنی پوری عمران متعصب فرنگیوں کے خلاف وقف کردی تھی۔ لیکن وہ انھیں اتنا نقصان نہ پہنچا سکا جتنا صلاح الدین نے بعد میں پہنچایا۔ نور الدین زنگی کے مرنے کے بعد اس نے یہ اہم خدمت اپنے ذمہ لے لی۔ اور اپنے آقا کی تمام آرزوؤں کو پورا کردیا۔ تمنائیں

عیسائی ہزاروں لاکھوں ٹڈی دل کی صورت میں دھاوے بولتے تھے ان کی ہمتیں اس قدر بڑھی ہوئی تھیں کہ مکہ معظمہ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لیکن خدا نے انھیں ناکام ونامراد کیا اور ان کے مقابلہ کے لئے سلطان صلاح الدین ایوبی کو بھیج دیا اس پُر جوش مجاہد نے سب طرف سے توجہ ہٹا کر اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دے لیا کہ بیت المقدس اور دوسرے اسلامی مقامات کو عیسائیوں سے پاک کردے چنانچہ زندگی کی آخری سانس تک وہ اُن سے لڑتا رہا۔ بہت سے مضبوط قلعے اور مشہور شہر اُن سے

چھین لئے تا آنکہ بیت المقدس بھی فتح کر کے اس پر اسلامی جھنڈا لہرا دیا۔ سلطان کے مسلسل حملوں سے عیسائیوں کا زور بہت کم ہو گیا تھا۔ انھوں نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کی ایک مرتبہ پھر کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ یہ لڑائیاں جنگِ صلیبی کہلاتی ہیں اور عیسائیوں کو ان میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

رات دن کی مسلسل محنت سے سلطان کی صحت پر بہت خراب اثر پڑا آخر ۱۶ر صفر کو وہ بخار میں مبتلا ہوا اور ۲۷ر ۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ تمام دنیا کے مسلمانوں نے اس کے ناوقت مرنے کا ماتم کیا۔

سلطان صلاح الدین صحیح معنوں میں ایک کامیاب شہنشاہ لائق جنرل اور پُر جوش مجاہد تھا۔ یہ اسلامی جوش ہی کا اثر تھا اور عیسائیوں کے خلاف اپنے اس مذہبی جوش اور جہاد کے شوق ہی کی بدولت اس نے مسلمانوں کی مختلف طاقتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیا اور بکھرے ہوئے موتیوں کو یک لڑی میں پرو دیا تھا اس کی فوج کا ایک ایک سپاہی اسی جوش سے لبریز تھا۔ اس کی بہادری ہمت اور استقلال کا دشمن بھی لوہا مانتے تھے۔ عیسائیوں کے دل اس کے نام سے دہلتے تھے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ بڑا عبادت گزار بھی تھا تہجد کی نماز کبھی قضا نہ ہوئی۔ قرآن سنتے وقت اکثر رو پڑتا تھا۔ لڑائی ہمیشہ جمعے کی نماز کے بعد شروع کرتا

تھا۔ اکثر اپنی چھوٹی سی فوج کے ساتھ محض اللہ کے بھروسے پر بڑی بڑی فوجوں سے بھڑ جاتا تھا۔ جہاد کے شوق میں سخت سے سخت بیماری، جاڑا، گرمی، برسات کسی چیز کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ایک بار گھٹنوں تک دنبل نکل آئے تھے بشکل ایک پہلو پر لیٹ سکتا تھا اس پر بھی لڑائی کے میدان میں بنفس نفیس گھوڑے پر سوار، فوج کو ترتیب دیتا تھا۔ کبھی کبھی سپاہی اُس کی شان میں سامنے ہی سخت کلمے کہہ دیتے تھے لیکن وہ ضبط کرتا تھا اور پی جاتا تھا کسی کی مصیبت کا حال سُن کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اُس کے یہاں کوئی حاجب تھا اور نہ دربان۔ چھوٹا ہو یا بڑا بلا تکلف اُس کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تھا۔ وہ بڑی کشادہ پیشانی سے ہر شخص کی سنتا اور اُن کی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔ کھانے پینے رہنے سہنے غرض ہر چیز میں سادگی تھی۔ سخاوت اور دریا دلی کا یہ حال تھا کہ مرتے وقت اس کے خزانے میں صرف ۴۷ درہم اور ایک دینار نکلا۔ اسلام نے ہمیشہ ایسے ہی پُرجوش اور مخلص مسلمانوں کی بدولت نئی قوت اور نئی زندگی حاصل کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اگلے دین دار مسلمانوں کا سچا نمونہ تھا۔

خواجہ معین الدین اجمیریؒ

خواجہ معین الدین سنجری چشتی اجمیری کے نسب کا سلسلہ حضرت علی سے ملتا ہے ۱۴ رجب ۵۳۷ھ ۱۱۴۲ء کو پیر کے روز سنجر نام ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اسی لئے سنجری کہلاتے ہیں پھر چونکہ ان کے بیروں میں ساتویں پشت میں ایک بزرگ چشت کے رہنے والے تھے جو اب افغانستان میں واقع ہے اس لئے چشتی بھی مشہور ہیں. تصوف کی طرف رغبت شروع ہی سے تھی. گیارہ سال کی عمر میں سفر کی نیت سے نکل کھڑے ہوئے اور سمرقند، بغداد، تبریز، بخارا، اصفہان مکہ اور مدینہ کی سیاحت کی اور اُس زمانے کے بڑے بڑے صوفی بزرگوں سے فیض حاصل کیا آخر میں حضرت خواجہ سلیمان ہارونی کے مرید ہو گئے اور کئی سال تک ان کی خدمت کی حضرت خواجہ سلیمان ہارونی نے انھیں خلافت عطا کی وہاں سے یہ ہندوستان تشریف لائے اور رائے پتھورا (اجمیر کے راجہ) کے زمانے میں

اجمیر میں آکر ٹھیرے اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔

ایک بار رائے پتھورا نے کسی وجہ سے ان کا کہنا نہ مانا اور ان کی شان میں برے لفظ کہے انھوں نے سُنا تو فرمایا کہ رائے پتھورا کو ہم نے زندہ گرفتار کرلیا۔ اسی زمانہ میں سلطان معزالدین کے لشکر نے رائے پتھورا کو شکست دی اور زندہ گرفتار کرلیا اسی وقت سے اجمیر پر مسلمانوں کا عمل دخل ہو گیا۔

خواجہ صاحب نے ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء میں وفات پائی اور جس جگہ ٹھیرے تھے وہیں دفن ہوئے پہلے قبر اینٹوں کی بنی تھی پھر اس پر پتھر کا صندوق بنایا گیا۔ بعد کے بادشاہوں نے خانقاہ دروازہ اور دوسری عمارتوں کا اضافہ کیا۔

حضرت خواجہ صاحب بہت ہی باخلاق اور متواضع بزرگ تھے غریبوں اور مفلسوں کی مدد کرنا فرض سمجھتے تھے۔ ایک بار کوئی کسان ان کی خدمت میں فریاد لے کر حاضر ہوا کہ "میرے کھیت یہاں کے حاکم نے ضبط کرلئے ہیں اور کہتا ہے کہ بغیر بادشاہ کی سفارش کے کھیت واپس نہ دئے جائیں گے اگر حضور اپنے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو لکھ دیں تو میرا کام بن جائے کیوں کہ وہ بادشاہ کے پیر ہیں" حضرت خواجہ صاحب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو صرف سفارش کا خط لکھ دیتے تو اس کا کام پورا ہو سکتا تھا۔ مگر انھوں نے فرمایا "میں خود تیرے ساتھ چلوں گا چنانچہ اُس کے

ساتھ دلی تشریف لے گئے، حضرت کے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین نے عرض کیا کہ "حضرت! آپ نے اتنے سے کام کے لئے کیوں تکلیف فرمائی" اُنھوں نے فرمایا "بھائی یہ ٹھیک ہے مگر تمھیں معلوم ہے ہر مسلمان رنج ومصیبت کے وقت اللہ تعالےٰ سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ یہ شخص جس وقت میرے پاس آیا بہت پریشان اور غمگین تھا اس سے ہمدردی، اس کے غم میں شرکت، اور اس کا کام نکال دینا ہزاروں عبادتوں سے بڑھ کر عبادت تھی" ان کی یہی اچھی باتیں تو تھیں جن کی وجہ سے کیا ہندو کیا مسلمان سب ان کی دل سے عزت کرتے تھے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔

حضرت خواجہ صاحب نے وعظ اور نصیحت اور اپنی خوش اخلاقی کے ذریعے ہندوستان کے بے شمار ہندوؤں کو مسلمان بنایا اور بیشمار مسلمانوں کو اسلام کا سیدھا راستہ دکھایا۔ یہاں کے مسلمان انھیں ہندوستان کا سب سے بڑا پیر مانتے ہیں اور ہر سال ان کے عرس میں ملک کے ہر حصہ سے لاکھوں کی تعداد میں آتے اور مزار پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ دیکھو حضرت خواجہ صاحب کے زمانے کے بادشاہ کو بس تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں مگر خواجہ صاحب کی فرماں روائی اب تک اُسی طرح قائم ہے۔ جو اللہ کے بندے اللہ کی مخلوق کی خدمت اپنا شیوا بنا لیتے ہیں وہ اسی طرح زندہ رہتے اور لوگوں کے جان ودل پر حکومت کرتے ہیں۔

ابن جبیر

ابوالحسین محمد بن احمد بن جبیر الکنانی دس ربیع الاول ۵۴۰ھ ۱۱۴۵ء کو ملبنسیہ میں پیدا ہوا۔ یہیں پرورش پائی۔ اپنے باپ اور دوسرے استادوں سے فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی پھر شاعری اور ادب کی طرف توجہ کی اور دوسرے علوم سیکھے۔ لیکن علم کی پیاس نہیں بجھی اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لئے ایک دوسرے مشہور عالم اور طبیب کے ساتھ عرب کا رُخ کیا پہلے حج کیا اور پھر دمشق بغداد وغیرہ کا چکر لگا کر اور حدیث، فقہ، ادب اور شاعری میں کمال حاصل کر گئے۔ دونوں ساتھ ہی وطن واپس آئے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد ابن جبیر غرناطہ کے گورنر عبدالمومن کا سکرٹری مقرر ہو گیا تھا۔ عبدالمومن نے اُسے ایک مرتبہ زبردستی شراب پلادی ابن جبیر کو اس سے بہت تکلیف ہوئی۔ اور اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لئے اُس نے حج کا ارادہ کیا وہ

۵۷۶ھ / ۱۱۸۳ء میں غرناطہ سے روانہ ہوا اور اسکندریہ (مصر) جدہ، مدینہ، کوفہ بغداد، موصل اور دمشق ہوتا ہوا ۵۸۱ھ / ۱۱۸۵ء میں سسلی کے راستہ سے غرناطہ پہنچا۔ اس سفر کے علاوہ اُس نے مشرق کے دو اور بھی سفر کئے ہیں ایک ۵۸۵ھ / ۱۱۸۹ء تا ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء میں اور دوسرا ۶۱۴ھ / ۱۲۱۷ء میں آخری سفر میں وہ صرف اسکندریہ پہنچا تھا کہ انتقال ہوگیا۔ اس کا سفرنامہ عربی زبان میں ایک اہم کارنامہ ہے خصوصاً سسلی کی تاریخ کے سلسلہ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

امام رازی

ان کا پورا نام امام فخرالدین ابو عبداللہ محمد بن عمر بن حسین الرازی ہے ۲۵ رمضان ۵۴۳ یا ۵۴۴ھ (۱۱۴۸ یا ۱۱۴۹ء) میں بمقام رَے پیدا ہوئے شروع شروع میں اپنے والد شیخ ضیاؤالدین عمر سے اور اُن کے انتقال کے بعد اس زمانے کے اور مشہور عالموں سے تعلیم حاصل کی۔ اور اس کے لئے کئی جگہ کا سفر کیا ایک عرصے تک مختلف مقامات میں رہے۔ اور مدتوں تک اُن سے پڑھتے رہے پھر رے تشریف لے گئے۔ اور وہاں ایک حاذق اور دولت مند طبیب سے تعلقات پیدا ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد حکیم بیمار پڑ گیا۔ جب اُسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تو اُس نے اپنی دونوں لڑکیوں کی شادی امام صاحب کے دونوں لڑکوں سے کر دی۔ تھوڑے دنوں کے بعد حکیم کا انتقال ہو گیا اور اس کی تمام دولت امام صاحب کے پاس منتقل ہو گئی۔ امام صاحب کو تمام دینی اور دنیاوی

علوم کے حاصل کرنے کا شوق تھا۔ فلسفہ زیادہ تر خود پڑھا اور اس قدر غیر معمولی کمال حاصل کیا کہ اپنے زمانے کے امام سمجھے جاتے تھے۔ طب کے فن میں ان کی نظر بہت گہری تھی۔ علم ادب وزبان سے بھی اچھی طرح واقف تھے شاعری کا بھی ذوق تھا اور عربی وفارسی میں شعر کہتے تھے ہر وقت علمی مشاغل میں منہمک رہتے تھے وقت کی اتنی قدر تھی کہ ایک لمحہ بھی ضائع کرنا گوارا نہ تھا۔ اکثر فرماتے کہ "کھانے میں میرا جو وقت ضائع ہوتا ہے اس کا مجھے بہت قلق ہوتا ہے کہ وقت اور زمانہ میرے لئے بہت قیمتی ہیں" اسی محنت اور شغف کی بدولت بہت جلد اُنھوں نے تمام اسلامی ممالک میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی۔ لوگ دور دور ملکوں سے مشکل مسئلے حل کرنے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور مطمئن ہو کر واپس جاتے تھے، بے شمار طالب علم ہر طرف سے مختلف علوم وفنون کی تحصیل کے لئے ان کے پاس آتے تھے اور ہر ایک امام صاحب کو علم کی انتہائی منزل پر پاتا تھا۔

ان کے درس کی مجلس بہت پُر رعب اور باوقار ہوتی تھی۔ پڑھاتے وقت طلبہ ایک خاص ترتیب سے بیٹھتے۔ بہترین اور ہونہار طالب علم ان کے قریب تر ہوتے۔ پھر دوسرے طلبہ اور پھر عام لوگ۔ جب کسی مسئلے پر گفتگو شروع ہوتی تو طلبہ خود بھی

آپس میں بحث و مباحثہ کر لیتے۔ کوئی مشکل مسئلہ آتا تو امام صاحب بھی بحث میں شریک ہو جاتے اور بحث کا حق ادا کر دیتے۔ لوگ ان کے تشفی بخش جواب سے بالکل مطمئن ہو جاتے۔

اس زمانے کے تمام علما، رؤسا، اور بادشاہوں کے دلوں پر امام صاحب کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا تھا اور وہ ان کی بے انتہا عزت کرتے تھے، چنانچہ جب امام صاحب، محمد بن تکش خوارزم شاہ کے پاس تشریف لے گئے تو وہ بے انتہا عزت و تکریم کے ساتھ پیش آیا اور نہایت بلند مراتب پر فائز کیا۔

جب ہرات تشریف لے گئے تو تین چار سو شاگردوں، ملازموں اور خدمت گاروں کا لاؤ لشکر ساتھ تھا۔ وہاں کے امیر نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا بہت عزت و احترام سے پیش آیا اور شاہی محل میں ٹھیرایا۔

والی ہرات نے امام صاحب کے اعزاز میں ایک شان دار علمی مجلس بھی ترتیب دی اس مجلس میں تمام علما اور امرا حاضر ہوئے امام صاحب صدر میں تشریف رکھتے تھے دائیں بائیں ترکی غلام تلواریں لئے صف باندھے کھڑے تھے۔ جب مجلس لوگوں سے پُر ہو گئی تو والی ہرات امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور آداب بجا لایا امام صاحب نے اُسے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا تھوڑی دیر میں سلطان شہاب الدین کا بھانجا حاضر ہوا

اسے آپ نے دوسری طرف بٹھایا۔ اس موقع پر امام صاحب نے نفس کے مسئلہ پر تقریر فرمائی اور علم کا دریا بہا دیا

امام صاحب وعظ بھی فرماتے تھے۔ لوگوں پر ان کے وعظ کا بہت اثر ہوتا تھا کبھی کبھی خود بھی متاثر ہوتے اور رو پڑتے۔ ہر طبقے اور مذہب کے لوگ آپ کے وعظ میں شریک ہوتے تھے۔ وعظ کے دوران میں لوگ اعتراض اور سوال کرتے اور آپ ان سب کا نہایت معقولیت اور خوش اسلوبی سے جواب دیتے ان کی وجہ سے بہت سے مذہبوں کے لوگ سنی مذہب میں داخل ہو گئے

درس و تدریس کے ساتھ آپ کا سب سے اہم مشغلہ تصنیف و تالیف تھا تفسیر، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، فلسفۂ و حکمت، طلسمات طب، نحو، ادب، شعر غرض اکثر علوم و فنون پر آپ کی تصانیف ہیں ان کتابوں کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ امام صاحب کی زندگی ہی میں اکثر کتابیں اسلامی ممالک میں رواج پا گئی تھیں۔

امام صاحب کے زمانے سے بہت پہلے سے اسلام کے مخالفوں کی طرف سے اسلام اور قرآن پر اعتراضات کئے جاتے تھے ان اعتراضات کے جوابات دینے کے لئے مسلمان عالموں نے ایک خاص علم ایجاد کیا تھا اور اس کا نام علم کلام رکھا تھا امام صاحب نے علم کلام پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں

اور ان میں ان اعتراضوں کے جواب دیئے ہیں ان کا سب سے بڑا کارنامہ تفسیر کبیر ہے یہ تفسیر بھی انھوں نے اسی نقطۂ نظر سے لکھی ہے یعنی قرآن پر جو اعتراضات کیئے جاتے تھے اس کتاب میں ان کے عقلی حیثیت سے جواب دیئے گئے ہیں اس سے پہلے اس طرز پر کسی نے تفسیر نہیں لکھی تھی یہ کتاب بہت ضخیم یعنی بارہ جلدوں میں ہے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ایک علیحدہ جلد میں ہے اسی طرح سورہ بقر کی۔ افسوس ہے کہ امام صاحب اس تفسیر کو مکمل نہ کر سکے۔

امام صاحب نے ۶۰۶ھ ۱۲۰۹ء میں پیر کو عید کے دن مزدا جان کے گاؤں (ہرات کے قریب) انتقال کیا شام کے وقت دفن ہوئے۔

آخری عمر میں موت کی بہت تمنا تھی فرماتے تھے "میں نے اپنے مقدور بھر علم کی تحصیل کی مگر اب مجھے سوائے اللہ تعالے کے دیدار کے اور کوئی آرزو نہیں ہے"

ابن اثیر

ابوالحسن علی بن ابی الکرم نام اور عزالدین لقب ہے لیکن ابن اثیر کے نام سے شہرت پائی ۴ر جمادی الاول ۵۵۵ھ ۱۱۶۰ء کو جزیرہ میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی پھر یہاں سے اپنے دونوں بھائیوں اور باپ کے ساتھ موصل میں آرہے اور یہاں کے عالموں سے فیض حاصل کیا یہاں سے کئی بار بغداد گئے۔ اور وہاں کے عالموں سے علم حدیث اور دوسرے علم سیکھے۔ شام اور بیت المقدس بھی گئے اور ان دونوں جگہوں کے بڑے بڑے عالموں سے بہت سی باتیں سیکھیں پھر موصل واپس آئے اور مستقل طور پر اپنے مکان میں مقیم ہو گئے تاکہ پوری توجہ اور دلجمعی کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول ہو جائیں۔

ابن اثیر حدیث کے حافظ اور تاریخ کے ماہر تھے علم انساب[۵]

---

۵ علم انساب یعنی اس بات کا علم کہ فلاں شخص فلاں خاندان سے ہے۔

سے گہری واقفیت تھی اُنھوں نے تاریخ الکامل کے نام سے مسلمانوں کی تاریخ کئی موٹی موٹی جلدوں میں لکھی ہے اس میں زمانہ اسلام کے شروع سے لے کر ۶۲۸ھ / ۱۲۳۰ء تک کے حالات و واقعات ہیں۔

اسی طرح صحابہ رضؓ کے حالات میں اسد الغابہ کے نام سے چھ جلدوں میں بہت ہی اچھی کتاب لکھی ہے۔

باوجود اس قدر عالم و فاضل ہونے کے بہت خلیق متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ شعبان ۶۳۰ھ / ۱۲۳۲ء میں موصل میں انتقال کیا۔

شیخ ابن عربی اندلسی

شیخ محی الدین ابو بکر محمد بن علی الطائی الحاتمی ۱۷؍رمضان ۵۶۰ھ؍۱۱۶۴ء میں پیر کے دن مرسیہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ ۵۶۸ھ؍۱۱۷۲ء میں اشبیلیہ گئے یہاں ۵۹۸ھ؍۱۲۰۱ء تک رہے اور مختلف علموں میں کمال حاصل کیا۔ یہاں سے علم کا شوق انھیں یورپ کے ملکوں (عرب و مصر وغیرہ) میں لے گیا اور وہاں انھوں نے اس زمانے کے مشہور عالموں سے فیض حاصل کیا! انھوں نے مصر کی سیاحت بھی کی حجاز میں مدتوں رہے۔ بغداد، موصل اور روم کی سیر کی اور ۲۸؍ربیع الاول ۶۳۸ھ؍۱۲۴۰ء کو پیر کے دن انتقال کیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت شیخ محی الدین ابن عربی امام ابو داؤد ظاہری کے پیرو (مقلد) تھے لیکن ان کا اصل میدان تصوف تھا اس میں انھوں نے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے بہت ترقی کی۔

بہت بڑے متقی، پرہیزگار اور عبادت گذار تھے اپنے زمانے کے بڑے بڑے صوفیوں اور پیروں کی خدمت میں رہے اور ان ہی کے قدموں کی برکت سے خود بھی مقبولیت حاصل کی حجاز اور شام کے بڑے بڑے صوفی بزرگوں نے ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے۔ علم تصوف میں ان کی کتابیں بہت مشہور ہیں۔ اور بعض تو اتنی مشکل ہیں کہ بڑے عالم اور تصوف کے علم کے ماہر بھی مشکل ہی سے انھیں سمجھ اور سمجھا سکتے ہیں. تصوف کے علاوہ حدیث، فقہ اور دوسرے علموں پر بھی کتابیں لکھی ہیں شاعر بھی بہت اچھے تھے۔

روپئے پیسے کی ہوس بالکل نہ تھی۔ سخاوت میں بھی مشہور تھے۔ ایک دفعہ ایک بہت شان دار مکان ان کی ملکیت میں تھا۔ ایک فقیر بھیک مانگنے آیا اُنھوں نے کہا۔ اس وقت سوائے اس مکان کے میرے پاس کچھ نہیں ہے اور وہی مکان اُسے دے ڈالا۔ دمشق میں مال و دولت حاصل کرنے کی بہت سی صورتیں پیدا ہوگئی تھیں مگر انھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہ کی۔ حمص کے امیر نے ۱۰۰ درہم سالانہ اور ایک دوسرے رئیس نے ۳۰ درہم روزانہ مقرر کر دیئے تھے مگر یہ سب خیرات کر دیتے تھے۔ یمن اور روم کے ملکوں میں اُنھیں بہت شہرت حاصل ہوگئی تھی۔

شیخ سعدی شیرازیؒ

شیخ شرف الدین ابن عبداللہ شیرازی، مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا۔ پیدائش کی صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر اور چودھویں صدی عیسوی کے شروع زمانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ بہت نیک با خدا متقی اور پرہیزگار تھے۔ شیخ سعدی کی بچپن کی تعلیم ان ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ اسی لئے پہلے ان کو روزہ نماز کے مسئلے یاد کرائے گئے باپ ان کی بہت نگرانی کرتے تھے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ اسی اچھی تعلیم اور تربیت کا اثر تھا کہ کلام پاک کی تلاوت اور عبادت وریاضت کا شوق پیدا ہوگیا تھا اکثر ساری رات عبادت کرتے تھے۔

شیراز میں بادشاہوں کے بار بار بدلنے سے بے امنی پیدا ہونے لگی تو شیخ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بغداد چلے گئے وہاں

کے مشہور مدرسۂ نظامیہ میں داخل ہوئے اور تھوڑے دنوں میں ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ تقریر ایسی اچھی کرتے تھے کہ دوسرے طالب علموں کو رشک پیدا ہوتا تھا۔ اُن کی طبیعت بچپن سے فقیری اور تصوف کی طرف راغب تھی تعلیم سے فارغ ہو کر اُنھوں نے بجائے دولت کمانے اور دنیا کی عزت حاصل کرنے کے فقیروں کے لباس میں سیر و سیاحت شروع کر دی ملکوں ملکوں کا سفر کیا۔ اس سیر و سفر میں انھوں نے تکلیفیں بھی برداشت کیں، پیروں میں چھالے پڑ پڑ گئے۔ فاقوں کی بھی نوبت آئی۔ ایک آدھ دفعہ حوالات اور قید کا مزا بھی چکھا غرض ہر طرح کے تجربے حاصل کئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشہور مسلمان سیاح ابن بطوطہ کے بعد سیاحت میں ان ہی کا نمبر ہے۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اپنا سفر نامہ نہیں لکھا۔ پھر بھی اس سلسلے میں انھوں نے جو تجربے اور سبق حاصل کئے ان سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا۔ اپنی مشہور کتاب "گلستاں" میں اکثر قصوں کی شکل میں اُنھوں نے ایک طرح سے آپ بیتی بیان کی ہے۔ ان قصوں سے بہت سے مفید اخلاقی سبق پڑھنے والے کو ملتے ہیں۔

عرصے تک سیر و سیاحت کے بعد وطن کی محبت انھیں شیراز کھینچ لائی۔ اس وقت یہاں امن و امان بھی ہو گیا تھا۔ یہاں وہ ابو بکر سعد زنگی کے درباریوں میں شامل ہو گئے۔ لیکن طبیعت

میں آزادی تھی بادشاہوں کی تعریف میں مبالغہ کرنا خودداری کے خلاف سمجھتے تھے. قصیدوں میں بجائے بے جا تعریف کے اکثر وعظ و نصیحت ہوتی تھی اس لئے ان کی زیادہ قدر نہیں ہوئی۔ پھر بھی اس زمانہ کے امیر اور وزیر شیخ کی بہت عزت کرتے تھے. خصوصاً ہلاکو خاں اور اُس کے بعد اُس کے بیٹے اباقاآن کے مشہور وزیر شمس الدین اور علاؤالدین، شیخ سعدی کے بہت معتقد تھے، شیراز میں ان کے تمام اخراجات وہی پورے کرتے تھے. انھوں نے شیخ کے لئے شہر سے باہر ایک خانقاہ بھی بنوادی تھی۔ اپنا آخری زمانہ شیخ نے اسی خانقاہ میں گذارا اور ۶۹۱ھ / ۱۲۹۱ء میں یہیں وفات پائی اور اسی خانقاہ میں دفن بھی ہوئے۔ بعد میں یہ مقام سعدیہ کے نام سے مشہور ہو گیا. لوگ اب تک ہفتہ میں ایک بار زیارت کو جاتے اور پورا دن مختلف دلچسپیوں میں گذارتے ہیں۔

شیخ صرف شاعر اور ادیب ہی نہیں بہت بڑے عبادت گذار صوفی بھی تھے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے مگر عام طور پر لوگ ان کو شاعر اور ادیب ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کی شاعری کی شہرت ان کی زندگی ہی میں دور دور پھیل گئی تھی کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ یہ سیاحت کے زمانے میں کسی مقام پر پہنچے اور اپنے آپ کو محض شیرازی (شیراز کا رہنے والا) ظاہر کیا لوگوں نے بڑے اشتیاق سے سعدی کا حال پوچھا اور

ان کا کلام سننے کی خواہش ظاہر کی اور اُنھیں جب یہ پتہ چلا کہ یہ خود حضرت شیخ سعدی ہیں تو بے انتہا عزت و اکرام سے پیش آئے۔

شیخ سعدی حقیقتاً اپنے زمانے کے بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے ان کی غزلوں اور قصیدوں کا ایک دیوان یا کلیات ان کے مرنے کے بعد ایک معتقد نے مرتب کیا ہے۔ لیکن ان کی چوٹی کی کتابیں جن کی وجہ سے انھیں لازوال شہرت نصیب ہوئی اور آج تک بچے بچے کی زبان پر ان کا نام ہے صرف دو ہیں گلستاں اور بوستاں، گلستاں نے خصوصاً بہت مقبولیت حاصل کی یہ کتاب نثر میں ہے اور اس میں اکثر اخلاقی نصیحتیں قصوں اور کہانیوں کے انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ اس کی عبارت بڑی سادہ شیریں اور دل میں گھر کرنے والی ہے۔ ہر خاص و عام اسے پڑھ کر متاثر ہوتا اور اس سے مفید اخلاقی سبق حاصل کرتا ہے۔ اس کتاب کے جواب میں بڑے بڑے مشہور ادیبوں نے کتابیں لکھنے کی کوشش کی لیکن وہ بات پیدا نہ کر سکے۔

گلستاں کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب تک لاکھوں استاد اُسے پڑھا چکے ہیں اور کروڑوں شاگرد اسے پڑھ چکے ہیں۔ اس کے بہت سے فقرے ضرب المثل بن گئے ہیں اور فارسی ہی نہیں اُردو میں بھی موقعے موقعے سے بے تکلف

استعمال ہوتے ہیں بے شمار لوگوں نے اس کی شرحیں لکھی ہیں یورپ کی اکثر زبانوں میں کئی کئی بار اس کا ترجمہ ہو چکا ہے خود ہندوستان کی کئی زبانوں گجراتی، ہندی، بنگلہ وغیرہ میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ اردو میں بھی اس کے بہت سے ترجمے موجود ہیں ابھی حال میں بجنور سے ایک بہت اچھا ترجمہ شائع ہوا ہے۔

مولانا رومیؒ

مولانا جلال الدین رومی عرف مولانائے روم ۶۰۴ھ کو بلخ میں پیدا ہوئے نسب کا سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے ملتا ہے ان کے دادا اور باپ دونوں بہت بڑے بزرگ تھے. باپ کی شادی خوارزم شاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی. مولانا نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے باپ مولانا بہاؤالدین رحؒ بلخی سے حاصل کی. پھر علامہ برہان الدین محقق کے سپرد کر دئے گئے جو مولانا بہاؤالدین بلخی کے بہت عقیدت مند مرید تھے. پھر علوم کی تکمیل کے لئے دمشق اور حلب تشریف لے گئے جو اُس زمانے میں علم اور فن کے مرکز سمجھے جاتے تھے اور ہر علم میں اس قدر کمال حاصل کیا کہ کوئی مشکل مسئلہ کسی سے حل نہ ہوتا تو وہ مولانا کے پاس لایا جاتا. مولانا نے تصوف کی تعلیم اپنے استاد مولانا برہان الدین محقق سے نو دس برس اُن کے ساتھ رہ کر حاصل کی مگر تصوف کا پورا رنگ

ابھی تک آپ پر نہیں چڑھا تھا۔ مذہبی علم پڑھاتے تھے وعظ بھی کہتے تھے اور فتوے بھی دیتے تھے۔ قوالی سے سخت نفرت تھی۔ آخر آپ کی ملاقات مشہور صوفی بزرگ حضرت شمس تبریزی سے ہوئی مولانا پر ان کا بہت اثر ہوا اُنھوں نے مولانا کی زندگی کو بالکل بدل دیا اور تصوف کے گہرے رنگ میں رنگ دیا۔ مولانا نے پڑھنا پڑھانا وعظ کہنا اور فتوے دینا غرض سب علمی مشغلے چھوڑ دئے اور ایک عرصے تک ان کے ساتھ رہ کر صوفیوں کے طریقہ پر چلے کھینچے شروع کئے۔ شہر کے لوگوں اور خود مولانا کے مریدوں کو مولانا کی یہ یک بیک بے تعلقی بہت ناگوار گذری اور سب حضرت شمس تبریزؒ کے مخالف ہو گئے۔ جب شورش زیادہ بڑھی تو حضرت شمس تبریز ایک دن چپکے سے نکل گئے۔ مولانا کو ان کی جدائی کسی طرح گوارا نہ تھی آخر یہ تکلیف برداشت نہ ہو سکی تو انھیں منا کر لائے مگر اس مرتبہ پھر کچھ ایسے ہی حالات پیش آئے۔ اور وہ پھر چلے گئے۔ ان کے بعد ایک زرکوب (شیخ صلاح الدین) کو مولانا نے اپنا پیر بنایا اور آٹھ نو برس بعد جب ان کا انتقال ہو گیا تو ایک صاحب حسام الدین چلپی سے جو پہلے ہی مولانا کے خاص معتقد تھے اسی قسم کا تعلق پیدا ہو گیا اور مولانا مریدوں کی طرح اُن کا ادب کرنے لگے۔

۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء میں شہر قونیہ میں ہیضے کی وبا پھیلی مولانا بھی اس

مرض میں مبتلا ہوئے اور اتوار پانچ جمادی الثانی ۶۷۲ھ ۱۲۷۳ء کو شام کے وقت انتقال کیا۔ صبح کو جنازہ اُٹھا۔ غریب، امیر، مسلمان عیسائی اور یہودی غرض ہر طبقے اور ہر فرقے کے لوگ جنازے کے ساتھ ساتھ تھے۔ اور روتے جاتے تھے۔ شام کو جنازہ قبرستان پہنچا اور مسلمانوں کا یہ محبوب بزرگ خاک کے سپرد کر دیا گیا چالیس دن تک لوگ مزار کی زیارت کو آتے رہے۔

مولانا روم پہلے بالکل عالموں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ تصوف کا رنگ چڑھنے کے بعد بھی پڑھنے لکھنے کا مشغلہ جاری رہا مگر وہ پہلے کی سی بات نہ تھی۔ اب عبادت اور ریاضت میں زیادہ مزا آتا تھا اور اسی میں زیادہ وقت گزرتا تھا دل میں سوز و گداز اور اللہ سے عشق و محبت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ نماز پڑھتے وقت اتنا روتے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

فقر و فاقہ کی زندگی پسند کرتے تھے لوگوں کے پاس سے بے شمار نذریں اور تحفے آتے لیکن سب اپنے مرید حسام الدین چلپی کے پاس بھجوا دیتے اور گھر میں کبھی کبھی فاقے سے گذر جاتی۔ معاش کا ذریعہ یہ تھا کہ محکمہ اوقاف سے ۱۵ دینار ماہوار ملتے تھے علاوہ اس کے فتوے بھی لکھتے تھے مگر یہ آمدنی بھی زیادہ تر اللہ کی راہ میں خرچ ہو جاتی تھی۔ فقیر یا سائل کے سوال پر کرتہ تک اُتار کر دے دیتے تھے تواضع اور خاکساری کا یہ حال تھا

کہ ایک دفعہ اپنے مرید حسام الدین چلپی کے یہاں گئے رات بہت گذر چکی تھی۔ ان کے گھر کا دروازہ بند تھا. مولانا نے لوگوں کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا اور دروازے پر کھڑے رہے حالاں کہ اس وقت کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور برف گر گر کر کپڑوں اور سر پر جم رہی تھی آخر صبح کو دروازہ کھلا تو اندر داخل ہوئے۔

مولانا کو بچوں سے بہت محبت تھی ایک دفعہ بازار میں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں بہت سے بچے ان کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور ان کے ہاتھ چومنے لگے۔ مولانا نے بھی پیار سے ان کے ہاتھ چومے۔ ایک لڑکا کچھ کام کر رہا تھا کہنے لگا "مولانا ٹھہرئیے گا میں ذرا اپنا کام کر لوں" مولانا وہیں کھڑے رہے اور جب اس لڑکے نے ہاتھ چوم لئے تو آگے بڑھے۔

ایک بار دو شخص سرِ بازار لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ "بے ایمان! اگر تو ایک کہے گا تو دس سنے گا" اتفاق سے مولانا بھی اُدھر سے آ نکلے۔ آپ نے فرمایا "بھائی! جو کچھ کہنا ہے مجھے کہہ لو تم ہزار بھی کہو گے تو انشاء اللہ اُس کے جواب میں ایک نہ سنو گے" وہ دونوں شرمندہ ہو کر مولانا کے قدموں پر گر پڑے اور آپس میں صلح کر لی۔

ایک دفعہ حمام میں نہانے کے لئے تشریف لے گئے۔ اور فوراً باہر نکل آئے لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ ایک شخص

حمام میں نہا رہا تھا حمام کے مالک نے میری خاطر اُسے ہٹانا چاہا اس لئے میں نکل آیا۔ غرض اس قسم کے بہت سے واقعے آپ کے متعلق مشہور ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود اس قدر علم اور بزرگی کے آپ میں کس قدر خوش خُلقی، سادگی، تواضع اور خاکساری تھی۔

حضرت شمسؒ تبریزؒ کی ملاقات سے پہلے آپ کو شاعری سے کوئی ایسی خاص دلچسپی نہ تھی اور آپ کے وطن کے لوگ اس مشغلے کو اچھی نظر سے بھی نہیں دیکھتے تھے مگر حضرت شمس تبریز کی جدائی کے بعد آپ کے دل میں اس قدر درد اور تڑپ پیدا ہوئی کہ شاعری کا چشمہ خود بخود اُبل پڑا۔ پہلے آپ غزل کہتے تھے اور اس میں اپنے دل کی واردات بیان کرتے تھے۔ آخری شعر (مقطع) میں اپنے پیر حضرت شمس تبریز کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ یہ دیوان ہی حضرت شمس تبریز کا ہے حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔

مولانا کی اصل تصنیف مثنوی ہے جو مثنوی مولانا روم کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں اُنھوں نے قصوں کے پیرایہ میں تصوف کے مسئلے حل کئے ہیں۔ یہ چھ بابوں یا چھ دفتروں میں ہے اور کئی سال میں جا کر تمام ہوئی ہے۔

اس مثنوی سے پہلے بھی بڑے بڑے صوفی بزرگوں نے

نظم میں تصوف کے نکتے بیان کئے ہیں مگر جو شہرت اور مقبولیت مثنوی نے حاصل کی وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی. فارسی زبان میں چار کتابیں سب سے زیادہ مشہور ہیں. شاہ نامہ، گلستاں، دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم. مثنوی کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے عالموں نے اس کی شرحیں لکھی ہیں اور اب تک لکھی جا رہی ہیں. صوفی لوگ اپنی مجلسوں میں اسے پڑھتے اور سر دھنتے ہیں واعظ اور مولوی اپنے وعظ میں اس کے شعر سنا کر لوگوں کے دلوں میں گرمی پیدا کرتے ہیں. یورپ اور ایشیا کے مشہور چھاپے خانوں سے اس کے بہترین ایڈیشن نکل چکے ہیں اور بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے.

قاضی ابن خلکان

قاضی القضاۃ شمس الدین بن خلکان عراق کے ایک مشہور خاندان سے ہیں ۶۰۸ھ ۱۲۱۱ء میں اربل نام ایک مقام میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم حاصل کی ۶۲۶ھ ۱۲۲۸ء میں حلب گئے اور دو سال قیام کے بعد دوسرے مقامات کا سفر کیا۔ آخر ۶۳۳ھ ۱۲۳۵ء میں دمشق میں مستقل طور پر رہنے لگے یہاں انھوں نے کئی مدرسوں میں پڑھانے کی خدمت انجام دی پھر حکومت نے انھیں شام کا قاضی بنا دیا۔ کچھ عرصہ شام میں رہنے کے بعد مصر گئے اور نائب قاضی القضاۃ مقرر ہوئے وہاں سے ۶۵۹ھ ۱۲۶۰ء میں دمشق کے قاضی القضاۃ بنا کر بھیجے گئے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد علیحدہ کر دئے گئے ۷۔۸ برس بعد پھر اپنے پچھلے عہدے پر بحال ہوئے مگر پھر وہی صورت پیش آئی آخر ۷۳ برس کی عمر میں ۶۸۱ھ ۱۲۸۲ء میں انتقال کیا۔

تاریخ کے زبردست ماہر تھے شاعری میں کمال حاصل تھا

اور عربی ادب سے بہت گہری واقفیت تھی انھوں نے صرف ایک ہی کتاب "وفیات الاعیان" کے نام سے لکھی ہے۔ ان کی تمام زندگی کا سرمایہ یہی کتاب ہے اُنھوں نے یہ کتاب ۶۵۴ھ میں مصر میں لکھنا شروع کی تھی اور ۶۷۲ھ میں تمام کی۔ بیچ میں سرکاری کاموں کی وجہ سے اس کا سلسلہ رُکا رہا۔ یہ دو جلدوں میں ہے اور اس میں مسلمان عالموں، شاعروں، ادیبوں، فلسفیوں، جغرافیہ دانوں، امیروں، وزیروں، بادشاہوں غرض ۸۰۰ مشہور مسلمانوں کے حالات ہیں، ان حالات کے جمع کرنے میں انھیں بڑی دقتیں اُٹھانی پڑی ہیں۔ غرض کہ سالہا سال تک لگاتار محنت کی ہے تب کہیں جاکر یہ مجموعہ تیار ہوا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یورپ کی اکثر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے لندن کے کتب خانہ میں اس کا ایک فارسی ترجمہ بھی موجود ہے۔ بعد کے بہت سے عالموں نے اس کتاب کا خلاصہ کیا ہے اور بے شمار لوگوں نے اپنی تصانیف میں اس سے مدد لی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ

تقی الدین احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام بن تیمیہ حرانی شام کے ایک شہر حران میں ۱۲ ربیع الاول ۶۶۲ھ / ۱۲۶۳ء کو پیر کے روز پیدا ہوئے۔ ان کی ماں حران میں وعظ کہا کرتی تھیں ان کا نام تیمیہ تھا۔ امام صاحب ان ہی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ سات سال کی عمر میں ان کے باپ انھیں دمشق لے گئے۔ وہاں انھوں نے بہت محنت اور توجہ سے تعلیم اور تربیت حاصل کی دس گیارہ سال کی عمر میں فقہ، حدیث، تفسیر، حساب وغیرہ کی تعلیم پوری کر لی۔ ۱۷ سال کی عمر میں باقاعدہ فتوے دینے اور کتابیں لکھنے لگے۔ ۲۱ سال کی عمر میں بہت سے عہدوں پر مقرر ہو چکے تھے اور قرآن کے مفسر کی حیثیت سے اُن کی شہرت دور دور پہنچ گئی تھی ۶۹۱ھ / ۱۲۹۱ء میں حج کیا۔ ۳۰ سال کی عمر میں علم اور عمل کے امام سمجھے جانے لگے، اور اُن کی

شہرت تمام اسلامی ملکوں میں پھیل گئی۔ اگرچہ حنبلی تھے مگر اکثر مسئلوں میں اپنے اجتہاد سے فتویٰ دیتے تھے یہ فتوے اکثر اس وقت کے عالموں کے فتوؤں کے خلاف ہوتے تھے اس لئے ان میں اور دوسرے عالموں میں اکثر مناظرے ہوتے رہتے رفتہ رفتہ اس مخالفت نے مخاصمت (دشمنی) کی صورت اختیار کرلی سلطان کے سامنے ان کی شکایتیں کی گئیں۔ اور یہ مصر لائے گئے بڑے بڑے عالموں اور قاضیوں کے سامنے ان کا مقدمہ پیش ہوا اور جیل خانے بھجوادئے گئے۔ دو برس کے بعد انھیں جیل سے نکالا گیا۔ اور ایک مجلس منعقد کی گئی جس میں ان کے مخالفوں نے ان سے مناظرہ کیا۔ یہ اس مناظرہ میں کامیاب ہوئے اور چھوڑ دئے گئے۔ مگر پھر ان پر الزام لگایا گیا۔ اور انھیں شام کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ پھر شام سے بلاکر قید کر دیا گیا۔ بعد میں انھیں اسکندریہ بھیج دیا گیا جہاں وہ آٹھ مہینے قید رہے۔ یہاں سے وہ مصر لائے گئے۔ مصر کے سلطان نے ایک بہت بڑی مجلس منعقد کی۔ اس میں تمام مشہور عالم اور مفتی موجود تھے انھوں نے تمام الزاموں سے انھیں بری کر دیا۔ اس وقت علامہ سے پوچھا گیا کہ تمھارے مخالفوں کو کیا سزا دی جائے۔ انھوں نے سب کو معاف کر دیا اب وہ قاہرہ میں رہنے لگے اور علم کے پھیلانے میں مصروف ہو گئے۔ مگر یہاں پھر

وہی فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس لئے یہاں سے دمشق چلے گئے یہاں بھی وہ اپنی عادت کے مطابق پڑھنے پڑھانے اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں لگ گئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک فتویٰ دیا جو اس زمانے کے عالموں کے خلاف تھا۔ ان کے دوستوں نے انھیں منع بھی کیا۔ مگر انھوں نے جواب دیا کہ "جو کچھ میں صحیح سمجھتا ہوں اس کا چھپانا میرے لئے ممکن نہیں" بادشاہ نے بھی انھیں اس قسم کا فتویٰ نہ دینے کا حکم دیا مگر انھوں نے اس حکم کی پروانہ کی آخر قید کر لئے گئے۔ آٹھ مہینے بعد رہائی ملی اور پھر اپنے کام میں لگ گئے مگر دشمن اب بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے انھوں نے ان کا ایک پرانا کوئی پندرہ بیس برس پہلے کا فتویٰ نکالا اور اس پر بہت لے دے کی اور بہت شور مچایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر قلعے میں قید کر لئے گئے۔ یہاں ان کے احترام کا پورا خیال رکھا گیا اور لکھنے پڑھنے کی آزادی دے دی گئی۔ مگر مخالفوں کی دراندازی سے یہ آزادی بھی چھین لی گئی اور لکھنے پڑھنے کا سامان واپس لے لیا گیا یہ تکلیف قید کی تکلیف سے کہیں زیادہ سخت تھی۔ کئی مہینے اُنھوں نے عبادت و ریاضت میں گزارے مگر کتابوں کے مطالعے سے محرومی کا صدمہ آخر رنگ لایا اور امام صاحب بیمار پڑ گئے۔ اور بیس[۲۰] بائیس[۲۲] روز کی بیماری کے بعد پیر کے روز ۲۰ ذی قعدہ ۷۲۸ھ میں انتقال فرمایا۔ جیل کے باہر یہ خبر پھیلی تو

ایک تہلکہ مچ گیا سارے شہر میں سناٹا چھا گیا. تمام آبادی قلعے میں اُمنڈ آئی. تقریباً ڈھائی لاکھ آدمی جنازے میں شریک تھے دو جگہ جنازے کی نماز پڑھائی گئی. تمام اسلامی ملکوں نے اس بزرگ کے دنیا سے اُٹھ جانے کا ماتم کیا اور چین تک میں جنازے کی نماز پڑھی گئی.

علامہ ابن تیمیہ بچپن سے بہت نیک اور سعادت مند تھے عبادت اور ریاضت کی طرف شروع ہی سے طبیعت کو رغبت تھی. ہر بات میں اللہ کی مرضی کو تلاش کرتے تھے علم حاصل کرنے کا شوق اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ کتابوں کے مطالعہ سے کبھی سیری نہ ہوتی تھی بچپن ہی میں علمی مجلسوں اور مناظرے کے جلسوں میں شریک ہونے کا شوق تھا اکثر بحثوں میں بھی حصہ لیتے تھے اور ایسے نکتے بیان کرتے تھے کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے.

وہ صرف عالم ہی نہ تھے مجاہد بھی تھے اُن کے خیال میں علما کا فرض ہے کہ وہ سیاست اور ملک کے معاملات میں بھی حصہ لیں قلم اور تلوار دونوں کے دھنی ہوں.

وہ ابھی ۱۷-۱۸ برس کے تھے کہ تاتاریوں کا فتنہ دوبارہ اُٹھا اور ہلاکو کے لڑکے غازان خاں نے دمشق پر چڑھائی کی. مصر کے بادشاہ نے مقابلے میں شکست کھائی. غازان خاں برابر بڑھتا چلا آرہا تھا دمشق میں اس کے آنے کی خبر سے بہت ابتری پھیل

گئی تھی۔ اس موقع پر امام صاحب نے باوجود کم عمری کے بہت عقل و تدبر جرأت، بہادری اور اسلامی اخوت کا ثبوت دیا۔ وہ خود غازان اور اُس کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے امن کا پروانہ لے کر آئے۔ کئی موقعوں پر بہت سے مسلمان قیدیوں کو دشمنوں سے چھڑایا۔

تقریبًا بیس اکیس برس کے بعد تاتاریوں نے پھر اس طرف چڑھائی کی۔ اس وقت بھی امام صاحب تاتاریوں کے پاس گئے اور کسی نہ کسی طرح اس فتنے کو ٹالا۔ اس کے بعد پھر تیسری دفعہ ان تاتاریوں کا ٹڈی دَل اس طرف روانہ ہوا۔ یہ خبر سنتے ہی مصر کے بادشاہ کے تو ہاتھ پیر پھول گئے اور بالکل ہمت ہار دی لیکن امام صاحب نے بہت سخت الفاظ میں اُسے غیرت دلائی اور پھر شام اور مصر کے لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی اور ان میں اسلامی روح پیدا کر دی آخر غازان کی ۹۵ ہزار فوج کو مسلمان مجاہدین نے تباہ و برباد کر دیا اور یہ اللہ کا بڑا احسان تھا کہ اُس نے علامہ کے ذریعے اسلام کی ایسی زبردست مدد کی۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی محبت علامہ کی رگ رگ میں سما گئی تھی انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی اور اصلاح کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ قرآن و حدیث سے دور جا پڑے تھے۔ نئے

مذہب پیدا ہو رہے تھے۔ عالموں میں خیال کی وہ آزادی اور خلوص وللہیت باقی نہ رہی تھی جو پچھلے بزرگوں کی خصوصیت تھی اس لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو صحیح، سچے اور خالص دین اسلام کو پھر سے رائج کرے امام صاحب کے وجود نے اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کر دیا۔ ابن تیمیہ اسی قسم کے بزرگ تھے انھوں نے اپنے اس اصلاحی کام میں شروع کیے آخر تک سختیاں اُٹھائیں مگر جس راستے کو حق سمجھتے تھے اُس سے اُنھوں نے منہ نہ موڑا۔

اُن کی تصانیف کی تعداد تین سو تک بتائی جاتی ہے ان میں سے بعض کتابیں مصر اور دوسرے مقامات میں چھپ گئی ہیں اور ان میں سے چند کتابوں کا اردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

شمس الدین الذہبی

ابو عبداللہ شمس الدین الذہبی ترکمانی ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے حدیث پڑھنے کا شوق تھا اس علم کے حاصل کرنے کے لئے اُنھوں نے دور دور کا سفر کیا اور آخر کار غیر معمولی کمال حاصل کیا مگر اُنھوں نے صرف اسی علم کے سیکھنے پر بس نہیں کیا بلکہ مصر جا کر ادب، تاریخ اور دوسرے شرعی علوم بھی سیکھے وہاں سے دمشق واپس آئے اور مختلف مدرسوں میں حدیث اور دوسرے علم پڑھاتے رہے۔ اپنے وقت کے امام سمجھے جاتے تھے، حدیث کے علاوہ تاریخ میں ان کا بڑا پایہ ہے اس علم (تاریخ) میں اُنھوں نے اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی ہیں ان میں تاریخ الاسلام، تاریخ دول الاسلام، تذکرۃ الحفاظ میزان الاعتدال، طبقات الحفاظ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے

ابن بطوطہ

ابو عبداللہ محمد بن محمد بن عبداللہ اللواتی ابن بطوطہ کے نام سے شہرت پائی ۷۰۳ھ / ۱۳۰۴ء میں طنجہ میں پیدا ہوئے اور ۲۲ سال کی عمر تک یہیں پڑھا لکھا اور عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ نہایت فراغت کی زندگی بسر کی۔ اس عرصے میں اپنے وطن سے جدائی کا اُن کے دل میں کبھی خیال بھی نہیں پیدا ہوا۔ ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء میں حج کے خیال سے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوئے حج سے فارغ ہو کر سیر و سفر کا خیال دل میں سمایا۔ مدینے سے ابتدا کی پھر شام گئے شام سے عراق فارس، مابین النہرین (بخارا اور سمرقند کا علاقہ) ایشیائے کوچک جنوبی روس، آستانہ، بخارا، افغانستان سے دہلی۔ اس سفر میں لوگ اُن سے بہت خوش اخلاقی اور عزت سے پیش آتے تھے۔ دہلی کے بادشاہ محمد تغلق نے تو انھیں اپنے یہاں کا قاضی بنا دیا اور پھر چین کے بادشاہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ ہندوستان

ہی کے سفر میں انھیں کچھ مصیبتیں بھی اُٹھانا پڑیں۔ ایک دفعہ چند ڈاکوؤں نے ان کا مال و اسباب، چھین لیا۔ سامان میں ان کے وہ کاغذات بھی تھے جن پر وہ اپنا سفر نامہ لکھ رہے تھے۔ یہ بھی ضائع ہو گئے اور خود اُن کی جان بڑی مشکلوں سے بچی۔

ان تمام ملکوں کا چکر لگا کر ۷۴۹ھ (۱۳۴۹ء) میں وہ فاس پہنچے۔ کچھ دنوں تک قیام کے بعد پھر سیاحت کا شوق پیدا ہوا مگر اس مرتبہ صرف اسپین میں گھوم کر جلد واپس آ گئے پھر تیسری بار افریقہ کی سیاحت کے لئے روانہ ہوئے اور دو سال کی مدت میں براعظم افریقہ کے تمام ملکوں، یہاں تک کہ ٹمبکٹو اور تکڈا وغیرہ کی بھی سیر کی اور پھر فاس لوٹ آئے۔

اس زمانے میں فاس کا امیر ابو عنان تھا۔ اُس نے ابن بطوطہ کی بہت قدر کی اور اپنے درباریوں میں شامل کر لیا۔ ابن بطوطہ دربار کے لوگوں سے اپنے سفر کی عجیب و غریب اور دلچسپ باتیں بیان کرتے رہتے تھے امیر کو یہ معلوم ہوا تو اُس نے ان کی خدمت میں بہت کچھ مال و دولت پیش کیا اور سفر نامہ لکھنے کی فرمائش کی خاص شاہی منشی محمد بن جزی کلبی انھیں مسودہ لکھنے کے لئے دیا گیا۔ ابن بطوطہ نے بڑی محنت سے یہ کتاب لکھنا شروع کی اور ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) میں ختم کی۔ "تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار" نام رکھا گیا۔

ابن بطوطہ یہ کتاب لکھنے کے بعد بھی عرصے تک امیر کے دربار میں رہے۔ آخر ۷۷۹ھ ۱۳۷۷ء میں انتقال کیا۔ وہ نہایت خوش اخلاق، دین دار۔ نمازی، پرہیزگار اور نرم دل تھے۔ ماں۔ باپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔

اس کتاب کو یورپ کے لوگوں نے بہت اہمیت دی۔ پہلے یہ نایاب بلکہ ناپید تھی۔ ان ہی نے اسے ڈھونڈھ کر نکالا اور بڑے اہتمام سے چھپوا کر شائع کیا لاتینی، انگریزی، جرمن، فرانسیسی غرض یورپ کی اکثر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اصل عربی کتاب مصر میں بھی دو دفعہ چھپ چکی ہے۔

خواجہ حافظؒ

خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی۔ پیدائش کی تاریخ کا پتہ نہیں چلا۔ ان کے باپ کا نام بہاؤالدین تھا وہ ایک کامیاب اور دولت مند تاجر تھے، مگر اُن کے مرنے کے بعد اس دولت کو سنبھالنے والا کوئی نہیں رہا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں افلاس نے آدبایا۔ بہاؤالدین کے اور بیٹے روزگار کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکل گئے خواجہ صاحب ابھی کم عمر تھے اس لئے ماں کے ساتھ رہے۔ آخر فقروفاقہ سے تنگ آکر ان کی ماں نے انھیں ایک شخص کے حوالے کردیا کہ ان سے کام لے اور ان کے کھانے پینے کا ذمہ دار ہوجائے کچھ بڑے ہوئے تو ایک نانبائی کی دکان پر آٹا گوندھنے کی نوکری کرلی۔ ان کے گھر کے قریب ہی ایک مکتب تھا یہ روز اس کے پاس سے ہوکر گزرتے لڑکوں کو پڑھتے دیکھتے تو خود بھی شوق پیدا ہوتا آخر اس محنت مزدوری کے ساتھ اُنھوں نے

پڑھنا بھی شروع کر دیا پہلے قرآن شریف حفظ کیا پھر کچھ پڑھنا لکھنا سیکھا۔ اس زمانے میں شاعری کی طرف عام رجحان تھا جس کی طبیعت ذرا بھی موزوں ہوتی وہ شاعر بن جاتا۔ ان کے محلے میں بھی اسی قسم کا ایک شاعر تھا۔ بزازے کی دکان تھی۔ اس کے اور دوست احباب بھی اس کے پاس آکر بیٹھتے اور شعر شاعری کا چرچا رہتا۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی خواجہ صاحب کو بھی شاعری کا شوق ہوا۔ طبیعت موزوں نہیں تھی۔ اس لئے جو کچھ کہتے وہ عجیب چیز ہوتی اور لوگوں کو دلچسپی کا اچھا خاصا سامان ہاتھ آجاتا۔ یہ لغو، مہمل اور اینڈے بینڈے شعر کہتے اور خوب خوب داد ملتی مگر ایک دفعہ ان کے ساتھ بہت مذاق کیا گیا۔ تو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بہت غمگین اور رنجیدہ ہوئے اور ایک بزرگ کے مزار پر دل کھول کر روئے۔ اسی رات کو ایک بزرگ خواب میں نظر آئے ایک نوالہ کھلایا اور کہا "جاؤ اب تمام علوم و فنون کے دروازے تم پر کھُل گئے۔ صبح کو اُٹھ کر انھوں نے بڑی اچھی غزل کہی اور لوگوں کو سنائی، سب حیران رہ گئے۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ ان ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ امتحان کے لئے مصرع طرح دیا گیا اور اُنھوں نے برجستہ ایک غزل کہہ ڈالی تب تو ان کی شاعری کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا اور ان کی شہرت وطن سے گذر کر دور دور پہنچ گئی۔

خواجہ صاحب کے زمانے میں شیراز میں بہت سی بادشاہتیں بن بن کر مٹیں مگر کم وبیش اکثر بادشاہوں اور اُن کے وزیروں اور امیروں نے ان کی خاطر خواہ قدر دانی کی۔ علاوہ اس کے دوسرے ملکوں کے بادشاہوں نے برابر ان کو اپنے ملک میں آنے کی دعوتیں دیں۔ بغداد کے فرماں روا نے بلایا ہندوستان میں بنگالہ کے بادشاہ نے دعوت دی۔ اور دکن کے بادشاہ نے تو سفر خرچ بھی بھیج دیا مگر انھیں اپنے وطن سے کچھ ایسی محبت تھی کہ کہیں بھی نہ گئے۔ ہر جگہ اپنی غزلیں بھیج دیں۔ سوائے مشہد مقدس کے اور کہیں کا سفر تاریخ سے ثابت نہیں ہے۔

مصلّیٰ ان کی سیر کی جگہ تھی اور رکن آباد ایک چشمہ تھا جہاں یہ دوست احباب کے ساتھ مل کر بیٹھتے تھے۔ اور پُر لطف صحبتیں رہتی تھیں۔ خود کہتے ہیں ؂

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر   نسیم بادِ مصلیٰ و آب رکنا باد

یعنی مصلیٰ کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوائیں اور رُکن آباد کا پانی مجھے سیر و سفر کی اجازت نہیں دیتے۔

خواجہ صاحب نے ۷۹۲، یا ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء میں انتقال کیا اور مصلیٰ میں دفن ہوئے جو ان کا محبوب مقام تھا۔ وہاں ایک خوب صورت مقبرہ بن گیا ہے اور اس مقام کا نام حافظیہ پڑ گیا ہے۔

خواجہ صاحب بہت صاف دل اور بے لاگ بزرگ تھے

ان کا ظاہر اور باطن ایک تھا بناوٹ اور تصنّع سے انھیں نفرت تھی اسی لئے انھوں نے اپنے شعروں میں مکّار صوفیوں اور فریبی اور ریاکار عالموں کی برائی کی ہے اور مذاق اُڑایا ہے۔

ان کی روزی کا دارمدار شاعری پر تھا۔ بادشاہ اور وزیر ان کی خدمت کرتے تھے اور یہ ان کی خدمت میں قصیدے اور غزلیں پیش کرتے تھے لیکن اگر کسی نے کچھ نہ دیا یا دینے میں دیر کی تو اُس زمانے کے شاعروں کی طرح ہجو نہیں کہہ ڈالتے تھے بلکہ صبر کرتے تھے اور کبھی کبھی بہت پُرمعنی الفاظ میں اشارہ کرجاتے تھے۔

خواجہ صاحب نے غزلوں کے علاوہ قصیدہ اور مثنوی بھی لکھی ہے۔ لیکن ان کا اصل میدان غزل ہے۔ اس میں انھیں غیرمعمولی کامیابی ہوئی۔ اور کوئی فارسی شاعر اُس وقت سے لے کر اب تک ان کے مقابلہ میں نہیں لایا جاسکتا۔ ان کا دیوان ان کے مرنے کے بعد ابو اسحٰق شیرازی نے مرتب کیا دیوان کی بہت سی شرحیں لکھی جاچکی ہیں اردو میں بھی پنجاب سے ایک شرح شائع ہوئی ہے۔ بہت سی غزلوں کا انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔

علامہ ابن خلدون

ابو زید عبد الرحمٰن بن محمد بن محمد بن خلدون پہلی رمضان کو ۷۳۲ھ (۱۳۳۲ء) میں ٹیونس میں پیدا ہوئے، بچپن میں قرآن حفظ کیا ذرا اور بڑے ہوئے تو لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ ادب کا علم اپنے باپ سے پڑھا۔ دوسرے اسلامی علم ٹیونس کے مشہور عالموں سے حاصل کئے تھوڑے ہی دنوں میں تمام علوم میں مہارت حاصل کر لی اور شہر کے معزز عالموں کی علمی صحبتوں میں شریک ہونے لگے رفتہ رفتہ بادشاہ تک رسائی ہو گئی اور اس نے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کر کے بڑے مرتبے پر پہنچایا مگر یہ زیادہ عرصہ تک ٹیونس میں نہ ٹھیر سکے اور کچھ ایسی صورتیں پیش آئیں کہ انھیں اندلس جانا پڑا۔ یہاں بھی وہ مختلف امیروں اور بادشاہوں کے یہاں بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کئے گئے مگر وہ جس امیر یا بادشاہ کے یہاں جاتے تھے زیادہ سے زیادہ ان کی قدر ہوتی

بھی، حاسد مصاحب اور درباری کسی نہ کسی طرح بادشاہ کو اُن سے بدگمان کر دیتے تھے اور آخر کار یا تو یہ قید میں ڈال دیے جاتے تھے یا پھر کسی دوسرے دربار کی طرف رخ کرنا پڑتا تھا غرض ان ہی اسباب سے کبھی انھیں چین نصیب نہ ہوا اس حالت میں بھی اُنھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے اور اس سے ان کی سیاسی قابلیت اور غیر معمولی تدبر کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان آئے دن کی مصیبتوں سے تنگ آکر آخر اُنھوں نے سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی اب وہ سارا وقت علمی مشغلوں میں گذارنے لگے۔ اور پورے چار برس تک ایک قلعہ میں بیٹھ کر اپنی مشہور تاریخ (تاریخ ابن خلدون) لکھنی شروع کی مگر اس کتاب کے لئے اور کتابوں کی ضرورت پڑی اور اس طرح اُنھیں وطن جانا پڑا۔ اس مرتبہ انھیں سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کیا گیا مگر اب کے وہ بہت جلد اس سے تنگ آگئے اور ۷۸۴ھ ۱۳۸۲ء میں حج کی غرض سے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں مصر میں ٹھیرے کچھ عرصہ اسکندریہ میں قیام کیا اور پھر قاہرہ چلے گئے۔ یہاں اُنھوں نے مشہور مدرسہ جامعہ ازہر میں کچھ دنوں تعلیم بھی دی مصر کا بادشاہ ان کی شخصیت سے واقف تھا اس لئے بڑی قدر کی اور قاضی القضاۃ بنا دیا۔

بدقسمتی سے یہاں بھی ان کے دشمن اور حاسد پیدا ہو گئے مگر بادشاہ ان سے برابر مطمئن رہا۔ اسی لئے تقریباً چھ بار اس عہدے سے برطرف اور پھر بحال کئے گئے۔ اسی زمانہ میں انھیں ایک بڑا حادثہ پیش آیا۔ انھوں نے اپنے بیوی بچوں کو مصر بلایا تھا مگر راستے میں طوفان کی وجہ سے جہاز تباہ ہو گیا اور جہاز کے ساتھ ان کا خاندان بھی سمندر میں ڈوب گیا۔ علامہ ابن خلدون نے اس صدمے کو بہت صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا اور اسی زمانے میں حج کے لئے تشریف لے گئے۔

اب انھوں نے انتہائی محنت کے ساتھ اپنی کتابیں لکھنی شروع کیں اور نا تمام تصانیف کو پورا کیا آخر ۷۰ سال کی عمر میں ۲۵ رمضان ۸۰۵ھ / ۱۴۰۲ء کو مصر ہی میں انتقال کیا۔

علامہ بن خلدون بہت بلند ارادہ اور عالی ہمت بزرگ تھے ان پر بڑی بڑی مصیبتیں پڑیں مشکلوں کا سامنا ہوا۔ مگر انھوں نے ہمیشہ نہایت ہمت اور استقلال سے ان کا مقابلہ کیا بہت باحیا خوش خلق، نرم دل اور کریم النفس تھے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے لوگوں نے ان کے اخلاق کی تعریف کی ہے۔

ان کی زندگی کا زیادہ حصہ اگرچہ سیاسی کاموں میں گزرا مگر باوجود اس کے انھوں نے اپنی علمی دلچسپیوں کو بھی برابر جاری رکھا وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ کسی

طرح ان جھگڑوں سے نجات ملے تاکہ اطمینان کے ساتھ علمی زندگی بسر کریں۔

انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں لیکن زیادہ اہمیت ان کی مشہور تاریخ "تاریخ ابن خلدون" کو حاصل ہے خصوصًا اس کتاب کے مقدمہ کو، یہ بجائے خود ایک مستقل کتاب ہے اس مقدمے کی وجہ سے انھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ یورپ کی اکثر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے خود اردو میں جناب حکیم احمد حسین صاحب الہ آبادی مرحوم نے پوری تاریخ کے ساتھ اس مقدمے کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

سلیمان اعظم

سلطان سلیمان سنہ ۹۰۰ھ ۱۴۹۴ء میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ سلطان سلیم نے اس کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی شروع جوانی ہی میں وہ حکومت کے کاموں میں لگا دیا گیا ایک عرصہ تک وہ سلطنت کے بعض حصوں کا حاکم رہا۔ سلطان سلیم جب وقت فارس کی طرف لڑنے گیا تو اُسے آستانے کا نائب بنایا گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف بیس سال تھی۔ باپ کے انتقال سے دو سال پہلے وہ ولایت سارو خاں کا حاکم تھا۔ غرض بچپن ہی سے ملک کے انتظام میں حصہ لینے کی وجہ سے اسے سلطنت کے کاموں میں بہت اچھا تجربہ حاصل ہو گیا تھا۔ اسی لئے ۲۶ سال کی عمر میں جب وہ خلافت کے تخت پر بیٹھا تو نہایت کامیابی سے حکومت کی۔

۱۶ شوال سنہ ۹۲۶ھ ۳۰ ستمبر سنہ ۱۵۲۰ء میں سلطان سلیم کا انتقال

ہوا اور سلطان سلیمان کی خلافت کا اعلان کیا گیا۔ اس نے سب سے پہلے باپ کی میّت کو بہت احترام کے ساتھ دفن کیا۔ اس کے پاس ایک شان دار مسجد اور ایک مدرسہ بنوایا۔

اس زمانے میں یورپ کے عیسائی ملک مسلمانوں سے سخت تعصب اور عناد رکھتے تھے۔ یہ تعصب ان متعصب پادریوں کا پھیلایا ہوا تھا جو اسلام کی اشاعت میں اپنے اقتدار کا خاتمہ سمجھتے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ متعصب اور جاہل عیسائی اور ان کے بادشاہ مسلمانوں کو طرح طرح سے پریشان کرتے رہتے تھے سلطان سلیمان جیسے مرد مجاہد کے لئے یہ بات برداشت سے باہر تھی۔ اس نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ مسلمان اتنے کمزور نہیں جتنا انھیں عیسائی قومیں سمجھتی ہیں اتفاق سے اس کی خلافت کے شروع زمانے میں اس کا ایک سفیر ہنگری گیا۔ ہنگری کے بادشاہ نے سفیر کو قتل کر دیا۔ سفیر کا قتل دنیا کے تمام ملکوں میں خلاف انسانیت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی سزا دینا لازمی تھا سلطان نے پہلے کچھ فوج چند سرداروں کی ماتحتی میں دوسرے شہر فتح کرنے کے لئے بھیج دی، اس فوج نے شہر شغا تبش کو فتح کیا اور آگے بڑھ کر بلغراد کا محاصرہ کر لیا اتنے میں خود سلیمان بھی بہت سی فوج کے ساتھ ان کے پاس پہنچ گیا۔ شہر والے قلعے میں بند ہو گئے اور نہایت بہادری کے ساتھ

مقابلہ کرنے لگے لیکن آخر قلعہ فتح ہوگیا اور ۲۵ رمضان ۹۲۷ھ کو مسلمان فوجیں شہر میں داخل ہوگئیں۔ اس کے بعد سلطان نے جزیرۂ روڈس کو فتح کیا۔ یہ جزیرہ مملکت ٹرکی اور دوسرے عثمانی علاقوں کے درمیان حائل تھا۔ یہاں کے باشندے ترکی حکومت کے خلاف ہمیشہ شرارتیں کرتے رہتے اور مسلمانوں کے لئے ایک مستقل عذاب بن گئے تھے۔ متعدد ترکی بادشاہوں نے اسے فتح کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی سلیمان کے نصیب میں تھی۔ جزیرے والوں نے ترکی حکومت کے کئی جہاز لوٹ لئے سلطان کو معلوم ہوا تو وہ فوجی تیاری کے ساتھ ان کی خبر لینے کے لئے نکل کھڑا ہوا، یہ لوگ قلعے میں بند ہوگئے اور پوری بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن سلیمانی فوج کے سامنے ان کی پیش نہ گئی آخر ہار گئے قلعہ حوالہ کردیا۔ اور خود قلعہ سے نکل گئے۔ سلطان ان لوگوں سے بہت نرمی اور مہربانی کے ساتھ پیش آیا اور جو لوگ قلعے میں رہ گئے تھے انھیں پوری مذہبی آزادی دے دی۔

۹۳۳ھ / ۱۵۲۶ء میں اُسے پھر شاہ ہنگری سے لڑنا پڑا۔ اس لئے کہ ان دونوں حکومتوں (ترکی اور ہنگری) کی باہمی دشمنی ختم ہونے میں نہیں آتی تھی اور برابر چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ اب کے سلطان نے پہلے سے بھی زیادہ لاؤ لشکر اکٹھا کیا تھا تقریباً ایک

لاکھ فوج تھی، تین سو توپیں اور ۸ سو کشتیاں یا جہاز خود سلیمان اس فوج کا سپہ سالار تھا۔

یہ بہت زبردست لڑائی تھی خود ہنگری کا بادشاہ لڑائی میں شریک تھا۔ ہنگری کی فوجوں نے بڑی ہمت دلیری، اور بہادری سے مقابلہ کیا مگر عثمانی بہادروں کے مقابلے میں نہ ٹھیر سکیں اور سخت نقصان کے بعد شکست کھا گئیں۔ بادشاہ بھی مارا گیا، جس سے تمام ملک کا دل ٹوٹ گیا۔ ہنگری کے دارالسلطنت بوڈاپسٹ کے حاکم نے خود بخود وہاں کی تالیاں سلطان کے پاس بھیج دیں سلطان بہت ہی شان اور تزک واحتشام کے ساتھ بوڈاپسٹ میں داخل ہوا۔ شہر کے لوگوں کو بلایا۔ انھیں ہر طرح کا اطمینان دلایا اور ایک عیسائی امیر کو وہاں کا حاکم بنا دیا۔ اور فتح وظفر کے شادیانے بجاتا قسطنطنیہ واپس آیا۔

لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد آسٹریا کے بادشاہ نے ہنگری پر قبضہ کر لیا اور سلطان کے بنائے ہوئے عیسائی بادشاہ کو نکال باہر کیا۔ سلطان پھر ڈھائی لاکھ فوج کے ساتھ ہنگری کی طرف روانہ ہوا اور بوڈاپسٹ کا محاصرہ کر لیا۔ آسٹریا کا بادشاہ چپکے سے اپنے ملک کے دارالسلطنت ویانا کی طرف چلا گیا۔ اور اُس کے فوجی افسر نے آپس میں سمجھوتے کے بعد بوڈاپسٹ سلطان کے حوالہ کر دیا سلیمان نے اُس عیسائی امیر کو پھر تخت

پر بٹھا دیا اور ویانا کی طرف بڑھا لیکن لڑائی کا سامان ختم ہو گیا تھا اس لئے بغیر فتح کئے ہوئے واپس آ گیا اور پھر کچھ ایسی صورتیں پیش آئیں کہ ویانا پر دوبارہ حملہ نہ کر سکا۔

اسی زمانے میں ایران اور عراق کی سرحدوں پر کچھ گڑبڑ شروع ہو گئی تھی۔ سلطان نے اپنے وزیر ابراہیم پاشا کو اس طرف بھیجا۔ اور پھر خود بھی گیا، ایران کے بادشاہ شاہ طہماسپ کو شکست دی، بغداد اور بعض دوسرے مقامات کو فتح کیا۔ اور مقامات مقدسہ کی زیارت کرتا ہوا قسطنطنیہ واپس آیا۔

ایک دفعہ دہلی نیز گجرات کے بادشاہ کی طرف سے پرتگالیوں کے خلاف امداد کی درخواست آئی سلطان نے مصر کے حاکم سلیمان پاشا کو حکم دیا کہ ایک بحری بیڑہ تیار کر کے پرتگالیوں کا مقابلہ کیا جائے سلیمان پاشا حکم کے مطابق ایک بہت بڑے بحری بیڑہ اور ۲۰ ہزار فوج کے ساتھ ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں عدن کو اور گجرات کے بہت سے قلعے پرتگالیوں سے چھین لئے۔ لیکن حالات کچھ ناموافق پیش آ گئے اور سلیمان پاشا بہت سامان غنیمت لے کر واپس چلا آیا۔ اسی زمانہ میں یمن بھی عثمانی حکومت میں شامل ہو گیا۔

سلطان کے حکم سے جزیرۂ کورسیکا بھی فتح کیا گیا اس کے علاوہ جزیرہ مالٹا پر بھی چڑھائی کی گئی لیکن برسات کی وجہ سے

فوجیں واپس آگئیں۔

آسٹریا کی سلطنت سے برابر لڑائی رہتی تھی۔ بیچ میں کچھ دنوں کے لئے صلح بھی ہوگئی تھی مگر معاہدے کے خلاف آسٹریا نے پھر ہنگری کے بعض مقامات پر قبضہ کرلیا۔ جس کی وجہ سے عثمانی فوجیں پھر حرکت میں آگئیں، سلطان اگرچہ نقرس کے مرض میں مبتلا تھا مگر اس فوج کے ساتھ تھا۔ آخر ایک نہایت اہم قلعہ کے محاصرہ کے وقت مرض نے بہت شدت اختیار کی اور عثمانی خاندان کے اس سب سے بڑے فاتح نے ۹۷۲ھ / ۱۵۶۴ء کو دنیا سے کوچ کیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ خبر بالکل پوشیدہ رکھی گئی تاکہ فوج پر بُرا اثر نہ پڑے اور جب قلعہ فتح ہوگیا تو عام اطلاع دی گئی۔

سلطان اپنے وقت کا بہت بڑا فاتح گذرا ہے اُس نے تقریبًا اپنی ساری عمر عثمانی حکومت کو بڑھانے (وسیع کرنے) میں صرف کردی۔ اس کے زمانے میں سلطنت کی ترقی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔

اس کے زمانے (سولھویں صدی عیسوی) میں کیا یورپ اور کیا ایشیا تقریبًا تمام ملکوں کے بادشاہ غیر معمولی حیثیت رکھتے تھے مشرق میں شہنشاہ اکبر (ہندوستان) اور شاہ اسمٰعیل طہماسپ (ایران) جیسے شہنشاہ۔ اور یورپ میں شاہ فرانس اول، چارلس دی ففتھ کوئن الزبتھ اور ان جیسے دوسرے بڑے بڑے حکمراں تھے لیکن عثمانی سلطان سلیمان اعظم کے آگے سب ماند تھے سارا

یورپ اُس سے کانپتا تھا۔ وہ نرا فاتح ہی نہ تھا بلکہ انتظامی قابلیت بھی غیر معمولی رکھتا تھا۔ اپنے ملک کے انتظام میں بہت سی اصلاحیں کیں بہت سے مفید قانون بنائے اسی لئے وہ ترکی قوم میں سلیمان قانونی کے نام سے بھی مشہور ہوا۔

عدل وانصاف، خوش خلقی، سخاوت وفیاضی، غیر معمولی سوجھ بوجھ، زبردست قوت ارادہ، حیرت انگیز انتظامی قابلیت، یہ سب ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے ایک طرف تو لوگ اس کے عاشق زار بن گئے تھے اور دوسری طرف اس کی ہیبت سے تھراتے تھے۔

خیر الدین پاشا

خیرالدین باربروسا جزیرۂ مدلہ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ رومیلی میں پیدل فوج میں نوکر تھا۔ جب سلطان محمد ثانی نے مدلہ کو فتح کیا تو اس کا باپ اسی جزیرے میں رہ پڑا۔ خیرالدین کے تین اور بھائی تھے۔ سب سے بڑے کا نام اسحاق تھا وہ تجارت کرتا تھا اور دو بھائی الیاس اور اردش (غالباً عروج) ملاحی اور سمندر میں لوٹ مار کا پیشہ کرتے تھے۔ خیرالدین بھی ان ہی دونوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ تھوڑے دنوں بعد وہ سلطان محمد حفصی بادشاہ ٹیونس کے یہاں ملازم ہو گئے۔ لوٹ مار کا پیشہ انھوں نے اب بھی جاری رکھا مگر اب وہ صرف عیسائیوں کی کشتیوں کو لوٹتے اور گرفتار کرتے تھے اور عیسائی ملاحوں اور کشتی سواروں کو غلام بنا کر بیچ ڈالتے تھے ایک روز انھوں نے اسی طرح ایک گرفتار کی ہوئی کشتی ترکی سلطان

کی خدمت میں اپنی اطاعت ظاہر کرنے کے لئے پیش کی سلطان نے انھیں قبول کیا اور دو قیمتی خلعتیں اور دس کشتیاں بھیجیں کہ ان سے وہ اپنے کام میں مدد لیں۔ اس سے ان کی طاقت اور شوکت اور بھی بڑھ گئی۔ اور انھوں نے ترکی سلطان کے نام پر مغربی ملکوں کے بہت سے جزیرے فتح کر لئے۔ خیرالدین کی ان کامیابیوں کے ساتھ ساتھ اس کے بھائی عروج نے الجزائر کا شہر فتح کیا اور اُس اسپینی فوج کو شکست دے دی جو الجزائر والوں کی مدد کے لئے۔ شارلکان نے بھیجی تھی۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد عروج۔ اسپین والوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ باوجود اس کے دشمن تلمسان، فتح کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ خیرالدین نے اس کی پوری حفاظت کی اور امیر الجزائر کو قتل کر دیا۔ اُس کی اس کامیابی کی خبر ترکی سلطان کے پاس بھیجی سلطان نے اسے مجمع الجزائر کا حاکم بنا دیا۔ اس طرح یہ علاقہ ترکی حکومت میں شامل ہو گیا اور یہاں سلطان کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری ہو گیا

خیرالدین نے عیسائیوں کے خلاف لوٹ مار کے سلسلے کو برابر جاری رکھا۔ عیسائیوں کی کشتیاں لوٹنا، اسپین، فرانس اور اٹلی کے ساحلی مقامات پر قبضہ کرنا اور عیسائیوں کو غلام بنانا اُس کا دن رات کا شغل تھا۔ اس نے وہ قلعہ بھی فتح کر لیا جو دشمنوں نے شہر الجزائر کے سامنے ایک چھوٹے سے جزیرے

میں بنایا تھا۔ پھر ترکی خلیفہ سلطان سلیم کی طرف سے اُس کے پاس حکم آیا کہ اہلِ فرانس کو پریشان نہ کرے کیوں کہ ترکی سلطنت سے اور اُن سے دوستانہ معاہدہ ہو گیا ہے۔ اس لئے اُس نے اپنی پوری طاقت اور پوری توجہ اسپین کی طرف پھیر دی اور اُن دہشتناک ظلموں کا پورا بدلہ لے لیا جو اہلِ اسپین نے غرناطہ کی فتح کے موقع پر مسلمانوں پر کئے تھے۔ علاوہ اس کے اسپین کے بہت سے مسلمانوں کو جو اسپانیوں کے ظلموں کا شکار تھے وہاں سے نکلنے میں مدد دی۔

۹۴۰ھ / ۱۵۳۲ء میں سلطان سلیمان نے اسے آستانے میں بلایا تاکہ امیرالبحر اندری دوریا کے حملوں کے روکنے کے لئے اُس سے مشورہ کرے۔ آستانے میں اُس کا بہت شاندار خیر مقدم کیا گیا اور سلطان نے اُسے حکم دیا کہ ٹیونس پر حملہ کرنے کے لئے ایک زبردست بیڑہ تیار کرے

۹۵۱ھ / ۱۵۴۴ء میں وہ مالٹا اور اٹلی کے بعض ساحلوں کو تاخت و تاراج کرتا ہوا سیدھا ٹیونس پہنچا۔ ٹیونس میں اس وقت مولائے حسن کی حکومت تھی۔ یہ اسلام کے مشہور دشمن شارلکان کا دوست تھا۔ اس لئے رعایا اُس سے ناراض تھی اور اُسے علیحدہ (معزول) کر کے اُس کے چھوٹے بھائی کو بادشاہ بنانا چاہتی تھی۔ خیرالدین کو رعایا کی اس برہمی سے بہت مدد ملی اور آخرکار وہ ٹیونس

پر قابض ہو گیا۔

لیکن شہنشاہ شارلکان کو اس کی خبر ملی تو اس نے مذہبی عیسائی سرداروں سے مدد مانگ کر ایک بہت بڑا بیڑا تیار کیا اور خود اس کا سردار بنا۔ اور ٹیونس کا محاصرہ کر لیا۔ خیر الدین نے پہلے تو اچھی طرح مقابلہ کیا لیکن جب اُس نے دیکھا کہ دشمن کی طاقت بہت زیادہ ہے تو مجبوراً ٹیونس کو چھوڑ کر چلا آیا۔ شارلکان کی فوج نے ٹیونس کے مسلمانوں پر ایسے دہشت ناک ظلم کئے کہ سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

اگرچہ اُسے ٹیونس سے اس طرح نکلنا پڑا تھا۔ لیکن جزائر پر اس کی ہیبت اور خوف اب بھی ویسا ہی تھا۔ اُس نے اپنے سترہ جہازوں کے بیڑے سے اہل اسپین سے شدید انتقام لیا اور جزیرہ مینورقہ کو لوٹ لیا جسے وہ کچھ دنوں پہلے چھوڑ دینے پر مجبور ہوا تھا۔ یہاں سے وہ پھر آستانہ واپس چلا گیا۔ ترکی سلطان نے اُس کی بے انتہا عزت کی اور اپنے یہاں کا سب سے بڑا خطاب (قبطان پاشا) عطا کیا۔

۹۴۴ھ/۱۵۳۷ء میں اُس نے دوبارہ اٹلی کے ساحلوں کو تاخت و تاراج کیا اور جب بندقیہ بھی ترکوں کے خلاف لڑائی میں شامل ہو گیا تو خیر الدین پاشا نے اُس کے تمام جزیروں کو جو بحر ارخبیل میں واقع تھے اُس سے چھین لیا ان کے علاوہ دو اور

شہروں ناپولی اور کاسٹل پر قبضہ کر لیا پھر کوروں اہل اسپین سے واپس لے لیا۔ ستمبر ۹۴۵ھ ۱۵۳۸ء میں پوپ، بندقیہ اور شہنشاہ شارلکان غرض عیسائیوں کے متحدہ بیڑے کا خیر الدین نے مقابلہ کیا اس عظیم الشان لڑائی میں شاندار فتح خیر الدین کی زندگی کا ایک اہم ترین کارنامہ ہے۔ اس موقع پر اس نے حیرت انگیز جرأت بہادری اور قابلیت دکھائی۔ باوجودیکہ اس کی طاقت دشمن کے مقابلہ میں بہت ہی کم تھی پھر بھی اس نے محض اپنی عقلمندی اور بہادری سے اتنی بڑی طاقت کو شکست دے دی۔ اور اگر رات کی وجہ سے دشمنوں کو بھاگ جانے کا موقع نہ مل جاتا تو اُن کے تمام جہاز مسلمانوں کے ہاتھ آجاتے اسی طرح ۹۴۸ھ ۱۵۴۱ء میں اس نے شارلکان کے بحری بیڑہ کو زبردست شکست دی۔

۹۵۰ھ ۱۵۴۳ء میں سلطان کے حکم سے شاہ فرانس کی مدد کے لئے وہ فرانسیسی بیڑہ میں شریک ہوگیا اور فرانس کے دشمنوں کا دینس باوجود اپنے قلعوں کی مضبوطی اور اپنے بہادر سپاہیوں کی حفاظت و نگرانی کے اسی کی بدولت فتح ہوا۔

ترکی حکومت کے لئے یہ اُس کی آخری خدمت تھی۔ اب وہ بہت بوڑھا ہوگیا تھا اور اس قابل نہ رہا تھا کہ جہاز میں بیٹھ کر دشمنوں کا مقابلہ کرے اس لئے امیر البحر کی حیثیت سے ترکی وزارت کا وہ ایک رکن بنا دیا گیا اس کی رایوں اور مشوروں کا

بہت احترام کیا جاتا تھا آخر ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء میں اس مشہور بحری افسر نے انتقال کیا اور باسفورس میں جو بشکتاش کے قریب ایک خوبصورت مقام ہے اسے دفن کیا گیا تاکہ مرنے کے بعد بھی اس کا جسم سمندر سے قریب رہے۔ اس کی قبر پر بہت ہیبت اور جلال ٹپکتا ہے۔

مرتے وقت اس نے وصیت کی کہ اس کے روپیہ سے اعلیٰ علوم کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا مدرسہ یا کالج قائم کیا جائے۔

شیر شاہ سوری

ہندوستان کے مشہور بادشاہوں میں شیر شاہ سوری ایک خاص حیثیت اور ممتاز درجہ رکھتا ہے وہ محض اپنی کوشش جانفشانی فراخ حوصلگی اور بلند عزمی کی بدولت نہایت معمولی حیثیت سے ترقی کرتے کرتے اس مرتبے کو پہنچا۔ اس شہنشاہ کا اصل نام فرید خاں ہے۔ پیدائش کی تاریخ صحیح طور سے معلوم نہیں مورخوں نے قیاس سے رجب ۸۷۸ھ/۱۴۷۳ء بتائی ہے اس کا باپ حسن خاں سوری پان سو سواروں کا افسر تھا۔

فرید خاں نے عربی اور فارسی کی تعلیم جون پور میں حاصل کی۔ جون پور سے واپسی کے بعد اُس کے باپ نے اپنی جاگیر کا انتظام اُس کے سپرد کیا۔ جسے اُس نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ یہ اُس کی ترقی کا پہلا زینہ تھا اس کے بعد یہ حوصلہ مند پٹھان برابر آگے ہی قدم بڑھاتا رہا رفتہ رفتہ فوج بھی اُس نے

اکٹھا کر لی اور اتنی طاقت بڑھا لی کہ مغل شہنشاہ ہمایوں کو دو بار زبردست شکست دی اُسے ہندوستان سے نکال دیا اور خود اس ملک کا بادشاہ بن گیا۔ لیکن پانچ برس سے زیادہ حکومت کرنا نصیب میں نہ تھا ایک قلعے کے محاصرے کے وقت ۹۵۲ھ / ۱۵۴۵ء میں آگ سے جل گیا اور اسی سے انتقال ہو گیا پھر بھی اپنی حکومت کی اس تھوڑی سی مدت میں اُس نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں کہ سن کر حیرت ہوتی ہے۔ اس کا دستور تھا کہ ملک کے جس حصے کو فتح کرتا سب سے پہلے اس کی ترقی کی طرف توجہ کرتا اور وہاں کی رعایا کو ہر قسم کی سہولتیں پہنچاتا۔ تاکہ خوش حالی پیدا ہو اور لوگ امن چین سے رہیں ملک میں آمدورفت کی سہولت کے لئے بہت سی پکی سڑکیں بنوائیں۔ ان سڑکوں کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگوائے۔ دو دو کوس کے فاصلے پر سرائیں بنوائیں۔ کنویں کھدوائے۔ سراؤں میں مسافروں کے ٹھیرنے اور کھانے پینے کا مفت انتظام کیا۔

ان سڑکوں میں سے ایک سڑک تو وہ ہے جو دریائے سندھ کے کنارے خلیج بنگال تک چلی گئی ہے یہ کوئی دو ہزار میل لمبی ہے اور اب تک اُس پر آمدورفت کا سلسلہ جاری ہے۔

جرائم کے انسداد کی طرف بھی اس کی پوری توجہ تھی۔ مجرموں کو بڑی سختی کے ساتھ سزائیں دیتا تھا۔ جس کی وجہ سے ملک میں

امن وامان ہو گیا تھا وہ اس بات پر بھی نظر رکھتا تھا کہ کہیں اس کے افسر اس کی رعایا کے ساتھ زیادتی نہ کریں اگر کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا تو بڑی سخت سزائیں دیتا۔ ایک دفعہ اُس کے لشکر میں سے کسی شخص نے کھیت میں سے غلہ کاٹ لیا۔ شیر شاہ کو خبر ہوئی تو اس کے حکم سے اس کی ناک چھدوائی گئی اور جو کچھ اُس نے کاٹا تھا اس میں باندھ کر ناک میں لٹکایا گیا اور اسی شکل سے اُسے تمام لشکر میں پھرایا گیا۔

ان سب باتوں کے علاوہ اُس نے اپنے ملک کی انتظام اور دیہاتوں کی مال گذاری کے لئے خاص قاعدے اور قانون بنائے تھے جس کی وجہ سے اُس کے ملک کی حالت پہلے سے کہیں اچھی ہو گئی تھی۔ اکبر کے زمانے میں اسی کے قانون پر عمل ہوتا تھا غرض وہ ہر حیثیت سے ہندوستان کا ایک بہترین بادشاہ تھا اور اگر اُسے اور زندہ رہنے کا موقع ملتا تو وہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیتا۔

ابوالفضل

ابوالفضل علامی شہنشاہ اکبر کا وزیر اعظم مصاحب خاص ۹۵۸ھ ۱۵۵۱ء میں پیدا ہوا۔ تیزی و ذہانت کی علامتیں ننھے پن سے ہی ظاہر تھیں۔ بارہ تیرہ مہینے کی عمر ہی کیا ہوتی ہے مگر اتنی سی عمر میں زبان کھل گئی تھی ۵ برس کا ہوا تو پڑھنے بٹھایا گیا پندرہ برس کی عمر میں پڑھ لکھ کر فارغ ہو گیا۔ آزاد

اس کا باپ شیخ مبارک بھی اپنے وقت کا بہت بڑا عالم تھا۔ لیکن طبیعت میں ذرا آزاد خیالی تھی اس لئے اُس زمانے کے عالم اس کے مخالف ہو گئے اُس کے خلاف کفر کے فتوے لگائے گئے اور شہنشاہ اکبر سے اس کی بے دینی کی شکایت کی گئی بادشاہ بھی مخالف ہو گیا اور یہ باپ بیٹے برسوں خانما برباد اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے۔ اس زمانے میں ابوالفضل نے کئی بار اپنے باپ سے کہا کہ ہمیں اس قدر ڈرنے

کی ضرورت نہیں بادشاہ کے سامنے ان عالموں سے بحث کریں انشاء اللہ ہم ہی غالب آئیں گے۔ شیخ مبارک بھی ابوالفضل کی رائے کو پسند کرتا تھا مگر اُس کا بڑا بیٹا فیضی ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے ذرا بھی چوک ہوگئی تو جان کا خطرہ ہے آخر خدا خدا کر کے مصیبت کے بادل چھٹنے شروع ہوئے۔ مخالفت کا زور کم ہوا اور تھوڑے دنوں کے بعد فیضی اور ابوالفضل کی دربار میں بھی رسائی ہوگئی۔ ابوالفضل پہلے میر منشی کے عہدے پر مقرر ہوا۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے وزیر اعظم ہوگیا اکبر کو اپنے درباریوں میں سب سے زیادہ اسی کی قابلیت اور تدبر پر اعتماد تھا۔ اور یہ اعتماد اتنا بڑھا کہ خاص درباری اور شاہزادے تک دشمن ہوگئے۔ آخر ۱۰۱۰ھ ۱۶۰۱ء میں شہزادہ سلیم نے باپ سے بغاوت کی اکبر نے ابوالفضل کو جو اس وقت کسی دوسری جگہ تھا فوراً بلا بھیجا۔ جہانگیر کو یہ بات معلوم ہوئی تو اندیشہ ہوا کہ اگر یہ بادشاہ کے پاس پہنچ گیا تو بادشاہ کا مزاج مجھ سے اور بھی برہم کر دے گا اس لئے ایک ہندو راجہ کے ذریعے راستے ہی میں قتل کرادیا اکبر کو خبر ہوئی تو مارے غم کے دو روز کھانا نہ کھایا۔

ابوالفضل علامی بڑا عالم وفاضل عقل مند، مدبر اور منتظم وزیر تھا۔ ہندوستان کے وزیروں میں اس سوجھ بوجھ اور قابلیت کا وزیر شاید ہی پیدا ہوا ہو۔ تحریر کا بادشاہ تھا۔

اس زمانے کے دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کا قول تھا کہ ہم اکبر کی فوج سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا کہ ابوالفضل کی تحریر سے اُس نے فارسی میں کوئی چھ کتابیں لکھی ہیں۔ آئین اکبری۔ اکبر نامہ کجکول چہار دانش۔ انشاء ابوالفضل اور ہفت اقلیم۔ ان میں آئین اکبری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ بندوبست اور مال گذاری کے متعلق قوانین کا مجموعہ ہے اِس کتاب کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا دماغ قانون بنانے میں کس قدر ماہر تھا۔ علاوہ اس کے سورۂ فتح کی تفسیر بھی عربی زبان میں لکھی ہے اور تفسیر اکبری نام رکھا ہے۔ حساب کتاب اور دوسرے دفتری معلومات سے بھی گہری واقفیت رکھتا تھا۔ انتظامی معاملات میں اُس کی رائے نہایت پختہ جنچی تلی ہوتی تھی۔ اس کے انتظام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس کے عہد وزارت میں پوری مملکت میں رعایا خوش حال اور فارغ البال رہی۔

لڑائی کے میدان میں وہ کسی بہادر اور دلیر جنرل سے کم نہیں تھا۔ چنانچہ کئی اہم معرکے اُس نے محض اپنی جرأت اور دلیری کی بدولت سر کئے ہیں۔

حضرت مجدّد الف ثانی رحؒ

مجدد الف ثانی رحؒ کا اصلی نام شیخ ابوالبرکات شریف عبدالدین احمد تھا حضرت شیخ عبدالاحد چشتی قدوسی آپ کے والد تھے۔ ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء میں ۱۴ شوال کو جمعہ کے دن سرہند (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ نسب کا سلسلہ امیرالمومنین حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے۔ جب کچھ بڑے ہوئے تو پڑھنے بٹھائے گئے اور تھوڑی مدت میں قرآن حفظ کر لیا اس کے بعد تفسیر، حدیث فقہ، منطق، فلسفہ وغیرہ تمام علوم اپنے والد اور دوسرے عالموں سے پڑھے، غرض ۱۷ سال کی عمر میں تمام علوم میں ماہر ہو گئے اور پڑھانا بھی شروع کر دیا۔

اس زمانے میں مشہور مغلیہ حکمران اکبر کی حکومت تھی اور آگرہ اس کا دارالسلطنت تھا۔ بڑے بڑے عالم یہاں جمع تھے حضرت مجدّد الف ثانی علم کے شوق میں آگرے تشریف لائے

اور بہت جلد وہاں مشہور ہو گئے۔ ابوالفیض فیضی اور علامہ ابوالفضل کو جو اکبر کے دربار کے مشہور عالم تھے حضرت مجدد الف ثانی سے ملنے کا شوق ہوا آپ کو ایسے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ تامل ہوتا تھا جو حکومت یا دربار سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان دونوں بھائیوں نے جب آپ کی طرف سے تامل دیکھا تو خود خدمت میں حاضر ہوئے اور بہت خلوص کا اظہار کیا۔ اور اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ اس طرح آپس میں ربط ضبط پیدا ہو گیا۔ اسی زمانے میں ابوالفیض فیضی قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ اس تفسیر میں خاص بات یہ تھی کہ اس کی عبارت میں کوئی نقطہ والا لفظ نہ تھا۔ مگر ایک موقع ایسا آیا کہ فیضی بے نقطوں کی عبارت لکھنے سے عاجز ہو گیا۔ اس نے آپ سے مدد کی درخواست کی۔ آپ کو ایسی عبارت لکھنے کی عادت نہ تھی مگر تھوڑی دیر میں آپ نے ایسی عمدہ تحریر لکھ دی کہ فیضی حیران ہو گیا کچھ عرصے کے بعد کسی بات پر حضرت مجدد اور ان لوگوں میں شکر رنجی ہو گئی۔ اسی زمانے میں حضرت مجدّد کے والد تشریف لے آئے اور انھیں وطن واپس لے گئے۔ راستہ میں ایک مقام تھانیسر پڑتا تھا وہاں کے حاکم نے اپنی لڑکی سے حضرت مجدّد کی شادی کر دی۔

۱۵۹۸ء / ۱۰۰۷ھ میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا تو آپ حج کے

ارادے سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں دہلی پڑتا تھا۔ یہاں آپ نے اپنے دوستوں سے ملنے جلنے کی غرض سے کچھ دنوں کے لئے قیام کیا۔ ان دنوں دہلی میں ایک بڑے صوفی بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہ تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی سے بھی اُن کی ملاقات ہو گئی اور آپ ان کے مرید ہو گئے۔ اپنے والد کی وجہ سے تصوف میں آپ کو پہلے سے دخل تھا بلکہ آپ ان کے خلیفہ بھی تھے مگر ان بزرگ کی برکت سے آپ نے اس علم میں بہت ترقی کی اور خود حضرت خواجہ باقی باللہ ان کا ادب کرنے لگے۔

اس زمانے میں تصوف کے علم میں کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں شامل ہو گئی تھیں۔ قوالی یا سماع کا عام رواج ہو گیا تھا اس عہد کے علما کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ صحیح اسلامی روح ان دونوں میں نہ تھی اور ان کے ان غلط عقیدوں کا اثر عام مسلمانوں پر بھی پڑ رہا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے ان دونوں طبقوں اور عام مسلمانوں کی اصلاح کے لئے بہت سرگرم کوشش کی۔ قوالی یا سماع کو ناجائز قرار دیا۔ اور غلط عقیدوں کو تصوف سے نکال دیا۔

آپ خود ذرا ذرا سی باتوں میں رسولؐ کی سنت کا خیال رکھتے۔ عام لوگوں کی اصلاح کے لئے آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اچھے اچھے مریدوں کو اپنا خلیفہ (قائم مقام) بنا کر ہندوستان

کے ہر حصے میں بھیج دیئے کہ لوگوں کو نیک باتوں کی ہدایت کریں ان لوگوں نے بہت اچھا کام کیا اور ان کی وجہ سے عام مسلمانوں خصوصًا فوج کے مسلمانوں کی حالت بہت سنبھل گئی۔

اب اکبر کا انتقال ہو چکا تھا اور اُس کا بیٹا سلیم جہانگیر کے لقب سے تخت پر بیٹھا تھا۔ اکبر نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے یا خدا جانے کس لئے اسلام کو بالکل پیچھے ڈال دیا تھا۔ اپنے کو خدا کہلواتا تھا اور لوگوں سے سجدے کراتا تھا۔ جہانگیر میں یہ بات تو نہ تھی پر وہ سجدہ ضرور کراتا تھا اور اس کی بے پروائی سے مسلمانوں کی حالت بہت پست ہو گئی تھی، مسجدیں ویران اور مدرسے برباد ہو رہے تھے اس کا ایک وزیر نہایت متعصب تھا اسے حضرت مجدد الف ثانی سے بغض تھا اسے آپ کی یہ مقبولیت اور آپ کے اثر سے مسلمانوں میں اتنی بیداری بہت ناگوار ہوئی اور آپ کے قتل کے درپے ہو گیا۔ خود جہانگیر کو بھی آپ کی اس غیر معمولی مقبولیت سے بہت پریشانی تھی۔ وزیر نے اس موقع کو غنیمت جانا اور بادشاہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ان کو ساتھیوں سمیت قتل کرا دیا جائے چنانچہ پہلے تو آپ کو دھوکہ دے کر بڑی عزت سے بلایا گیا جب آگرے پہنچ گئے تو انھیں بادشاہ کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ آپ نے بادشاہ کو سلام تک نہ کیا۔ جب وزیر اور بادشاہ بحث میں لاجواب ہو گئے تو وزیر نے

بادشاہ کو یہ شہ دی کہ "اس فقیر نے آپ کو سجدہ تو سجدہ سلام تک نہ کیا"۔ حضرت مجدد نے اس کا معقول جواب دیا مگر بادشاہ کو بھی ضد ہوگئی اور اُس نے سجدے کا حکم دیا۔ اور جب اُنھوں نے انکار کیا اور فرمایا کہ یہ سر سوائے خدا کے اور کسی کے سامنے نہیں جھک سکتا تو کہا "خیر سر جھکا دو میں اسے سجدہ سمجھ لوں گا" انھوں نے اس سے بھی انکار کیا تو بادشاہ کے نوکروں نے زبردستی سر جھکانا چاہا اور بڑے بڑے طاقتور لوگ اللہ کے اس بندے کا سر نہ جھکا سکے بادشاہ آپ کی ہیبت سے بہت سہما ہوا تھا علاوہ اس کے اُسے اپنی مسلمان رعایا میں بغاوت کا بھی خطرہ تھا اس لئے قتل کا حکم تو نہ دے سکا البتہ آپ کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ مسلمانوں میں اس خبر سے بڑی بے چینی پھیل گئی۔ خود حکومت کے بڑے بڑے عہدے دار جو آپ کے معتقد تھے بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ غرض بادشاہ بڑی مصیبت میں مبتلا ہوگیا اور سال بھر تک پریشانیاں اُٹھاتا رہا۔ آخر کار اپنے کئے پر پشیمان، اور آپ سے معافی کا طلب گار ہوا۔ آپ نے اس کے سامنے یہ شرطیں پیش کیں کہ سجدہ کی رسم بالکل اُٹھا دی جائے۔ مسجدیں پھر سے آباد کی جائیں اور مسلمانوں کے اسلامی اور شرعی معاملات میں بالکل دخل نہ دیا جائے۔ بادشاہ نے آپ کی سب شرطیں قبول کیں اور آپ کو بہت عزت کے ساتھ رہا کر دیا۔

رہائی کے بعد پھر آپ نے تبلیغ و ہدایت کا کام شروع کر دیا اور آپ کی شہرت ہندوستان سے گذر کر ایران و عرب میں پہنچ گئی اور ان دور دور کے ملکوں میں بھی آپ کے بہت سے معتقد پیدا ہو گئے۔

آخر ۱۰۳۲ھ ۱۶۲۲ء میں مسلمانوں خصوصًا ہندوستان کے اس سب سے بڑے مسلمان بزرگ نے وفات پائی۔ انتقال سے پہلے انھوں نے تاکید کر دی تھی کہ معمولی مسلمانوں کی طرح میرا کفن دفن ہو اور مجھے ایسی گم نام جگہ دفن کیا جائے کہ تھوڑے دنوں کے بعد میری قبر کا نشان تک مٹ جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رح کے صاحب زادے ہیں نسب کا سلسلہ حضرت عمر فاروق رضہ سے ملتا ہے ۴ شوال ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء کو بدھ کے دن پیدا ہوئے ان کا خاندان شروع سے علم وفضل میں ممتاز رہا ہے ان کے باپ بہت بڑے عالم اور صوفی تھے۔ شاہ صاحب ۵ برس کی عمر میں مکتب میں بٹھائے گئے۔ ساتویں سال قرآن ختم کیا اور فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ ایک سال میں فارسی کی تمام کتابیں ختم کرلیں۔ پندرہویں سال عربی کی تمام کتابیں ختم ہوگئیں۔ ان کے باپ نے اس خوشی میں بہت بڑا جلسہ کیا۔

تعلیم سے فارغ ہوکر شاہ صاحب دن رات کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے اپنے شوق اور محنت کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصے میں اپنے زمانے کے تمام عالموں سے بڑھ گئے۔

جب تمام علوم میں کمال حاصل ہو گیا تو ان کے باپ نے۔ جو خود بہت بڑے صوفی تھے اپنا مرید کر لیا شاہ صاحب نے ۱۷ سال کی عمر میں اس میں بھی کمال حاصل کر لیا اسی سال ان کے باپ کا انتقال ہو گیا اور یہ ان کی جگہ پڑھانے لگے۔ بہت تھوڑی ہی مدت میں تمام ہندوستان میں ان کے علم و فضل کی شہرت ہو گئی۔ اور لوگ چاروں طرف سے علم حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس امنڈ آئے۔

ہندوستان میں شروع سے قرآن اور حدیث کی طرف عالموں کی توجہ کم رہی ہے حالانکہ یہی دونوں چیزیں مذہب کی اصل اور بنیاد سمجھی جاتی ہیں۔ ہندوستانی عالم اور استاد، طالب علموں کو فقہ کی چند کتابیں اور حدیث کی کوئی معمولی سی کتاب پڑھا دیتے تھے یہاں کے عالم اور عام مسلمان فقہ ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ شاہ صاحب سے پہلے حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث کو رواج دینے کی کوشش کی تھی لیکن ان کی کوششوں کا اثر زیادہ دنوں تک نہ رہ سکا۔ حضرت شاہ صاحب نے اس طرف خاص طور سے توجہ کی اور صحیح معنوں میں قرآن و حدیث کو ہندوستان میں زندہ کر دیا۔ اپنے درس (پڑھانے) میں، اپنی کتابوں میں غرض ہر جگہ انھوں نے قرآن و حدیث کو سب علموں پر مقدم رکھا۔ علم حدیث پر کئی کتابیں لکھیں۔ قرآن کا فارسی میں

ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی ہندوستان کے جاہل عالموں نے اس ترجمے کی وجہ سے شاہ صاحب پر کفر کا فتویٰ لگایا اور ایک دفعہ قتل کے ارادے سے فتح پوری کی مسجد میں شہر کے چند شہدوں کو لے کر جمع ہو گئے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے شاہ صاحب کو ان کی شرارت سے محفوظ رکھا۔

اسی زمانے میں شاہ صاحب حج کی غرض سے حجاز گئے۔ حج کے بعد ایک سال تک مدینے میں رہے اور وہاں کے بڑے بڑے عالموں سے حدیث پڑھی۔ وہاں سے واپسی پر پھر قرآن و حدیث کا درس شروع کر دیا اور کتابیں لکھنے میں مشغول ہو گئے۔

اس زمانے میں گمراہ صوفیوں اور پیروں کا بہت زور تھا اور ان نقلی پیروں کی وجہ سے مسلمانوں میں طرح طرح کی گمراہیاں پھیل گئی تھیں۔ شاہ صاحب خود بہت بڑے صوفی تھے مگر اُنھوں نے ان سب خرابیوں کو محسوس کیا اور ان میں بڑی حد تک اصلاح کی کوشش کی۔ اسی طرح عربی تعلیم کا انتظام تھا اس کو درست کیا نصاب تعلیم خود بنایا اور اس میں قرآن و حدیث کو خاص طور پر شامل کیا۔

۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) میں شاہ صاحب دوبارہ حج کے لئے گئے اور رجب ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں واپس تشریف لائے۔ تصنیف و تالیف کا مشغلہ ساتھ

ساتھ چلتا تھا۔ اس عرصے میں انھوں نے حدیث، فقہ، تصوف اور دوسرے علموں سے متعلق بہت سی بہترین کتابیں لکھیں جو آج تک مقبولیت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس زمانے کے اکثر عالم ان کو مجتہد سمجھتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے ۶۲ سال کی عمر ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء میں انتقال کیا اور پرانی دہلی میں اپنے والد کی قبر کے پاس دفن ہوئے۔

حضرت شاہ صاحب کے مزاج میں بے انتہا سادگی تھی۔ بچپن میں کھیل کود میں وقت نہیں گنوایا ایک بار اپنے کسی ساتھی کے ہمراہ باغ کی سیر کو گئے تھے واپس آئے تو مہربان باپ نے پوچھا بیٹا! اب تک تم کہاں تھے اچھا بتاؤ اتنی دیر میں تم نے کیا حاصل کیا دیکھو اتنی دیر میں میں نے اتنا درود پڑھ لیا۔ شاہ صاحب مارے شرم کے پسینے پسینے ہو گئے اور پھر کبھی اس طرف رُخ نہیں کیا۔ طبیعت میں خاکساری اور انکسار بہت تھا ہر شخص سے خواہ وہ کتنا ہی معمولی درجہ کا ہوتا اخلاق سے ملتے بزرگوں کا بہت ادب کرتے۔ کبھی کسی کی غیبت نہیں کی۔ دشمن کے حق میں بھی اچھی دعا مانگتے۔ بہت مہمان نواز تھے۔ فقیروں اور حاجت مندوں کی کچھ نہ کچھ امداد کرتے رہتے۔

غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ مرزا نوشہ رجب ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء کو آگرے میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی فارسی زبان ایک ایرانی سے پڑھی اور بہت کمال حاصل کیا۔ بچپن ہی سے دلی آتے جاتے رہتے تھے شادی کے بعد مستقل طور پر دلی میں آکر بس گئے۔

ان کے نانا بہت دولت مند آدمی تھے اس لئے ابتدائی زندگی بہت آرام اور اطمینان سے گذری۔ اس کے بعد ایک ریاست سے سات سو روپیہ سالانہ ملتا رہا۔ مگر شادی کے بعد خرچ میں زیادتی کے سبب ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ اس لئے تقریباً پچاس برس تک دلی میں رہے مگر کبھی مکان نہیں خریدا ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں رہے اسی طرح کبھی کتاب نہیں خریدی کرایہ پر کتابیں منگواتے تھے اور پڑھ کر واپس کر دیتے تھے۔

مرزا کو جو پنشن ملتی تھی ان کا خیال تھا کہ ان کے حق سے بہت کم ہے چنانچہ اس کے لئے سرکار انگریزی میں بہت کچھ دوڑ دھوپ کی۔ اسی سلسلے میں کلکتے بھی گئے۔ راستے میں چند دنوں کے لئے لکھنؤ بھی ٹھیرے۔ لکھنؤ والوں نے ان کی بہت آؤ بھگت کی کلکتے میں انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی اور لکھنؤ ہوتے ہوئے دلی واپس آئے۔

۱۲۵۸ھ ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج میں ایک فارسی پروفیسر کی ضرورت تھی دوسرے امیدواروں کے ساتھ مرزا بھی بلوائے گئے مگر ان کی توقع کے مطابق ان کی عزت نہیں کی گئی۔ اس لئے ملازمت سے انکار کر دیا۔

۱۲۶۶ھ میں ابوظفر سراج الدین بادشاہ نے استاد ذوق کے انتقال کے بعد مرزا غالب کو شاعری میں اپنا استاد بنایا دربار میں نجم الدولہ دبیر الملک کا خطاب اور خلعت مرحمت فرمایا اور پچاس روپیہ ماہوار پر اردو میں مغلوں کی تاریخ لکھنے پر مامور (مقرر) کیا مرزا اس تاریخ کی صرف ایک ہی جلد لکھنے پائے تھے کہ غدر ہوگیا اور یہ سلسلہ ہی ختم ہوگیا۔

۱۲۷۴ھ ۱۸۵۷ء میں دہلی میں وہ زبردست ہنگامہ ہوا جسے غدر کہتے ہیں اور جس کی وجہ سے مغلیہ حکومت کا آخری ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل ہوگیا۔ یہ بڑی پریشانی کا زمانہ تھا۔ دلی کے بڑے بڑے

شریف گھرانے مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے۔ بہت سے شریف اور امیر مارے گئے بہت سے روٹیوں کے محتاج ہوگئے اور بہت سے دلی سے باہر چلے گئے۔ مرزا اس زمانے میں گھر سے باہر نہ نکلے پھر بھی بہت پریشان رہے۔ غدر کے بعد پنشن بند ہوگئی آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ دو برس تک اس طرح پاپڑ بیلے دو برس کے بعد نواب رامپور نے سو روپیے مہینہ مقرر کردیا اور کچھ عرصہ کی کوشش کے بعد پنشن بھی دوبارہ جاری ہوگئی تب کچھ اطمینان نصیب ہوا۔ آخر ۲ ذی قعد ۱۲۸۵ھ (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) کو تہتر برس کی عمر میں انتقال کیا اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ میں دفن کیے گئے۔

مرزا غالبؔ بہت ہی حوصلہ مند اور با اخلاق بزرگ تھے جو شخص اُن سے ایک بار مل لیتا اُسے پھر دوبارہ ملنے کا شوق رہتا، ہندو، مسلمان اور ہر مذہب و ملت کے لوگ اُن کے دوستوں میں شامل تھے اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے انھوں نے شاگردوں کے علاوہ بے شمار معتقد پیدا کرلئے تھے۔ اکثر خرچ سے تنگ رہتے تھے مگر ہاتھ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ بہت سے فقیر اُن کے دروازے پر پڑے رہتے۔ اپنے مصیبت زدہ دوستوں کی وہ اس طرح مدد کرتے تھے کہ دوسروں کو شبہ بھی نہ ہوتا تھا۔ ان کے ایک معزز اور خاندانی دوست کی حالت

غدر کے بعد بہت خراب ہوگئی تھی یہ ایک بار چھینٹ کا فرغل پہن کر مرزا سے ملنے آئے مرزا نے اس بہانے سے کہ یہ فرغل بہت پسند آیا ہے، اپنا قیمتی فرغل انھیں دے دیا اور ان کا خود لے لیا۔ دوستوں کے خطوں کا جواب دینے میں انھیں خاص لطف آتا تھا اور ان کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہو جاتے تھے

مرزا غالب فطری شاعر تھے اُن کی شاعری کا زمانہ بچپن سے شروع ہوتا ہے۔ آٹھ نو سال کی عمر میں جب وہ پتنگ اُڑاتے تھے۔ اُنھوں نے پتنگ پر ایک مثنوی لکھی تھی۔ وہ اس موجودہ زمانہ کے رواج کے خلاف کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ جو کچھ کہتے تھے اس کی اصلاح بھی خود ہی کرتے تھے۔ ان کی شاعری کی ابتدا فارسی سے ہوتی ہے اور اسی پر انھیں فخر تھا مگر بعض دوستوں کے مشورے اور اصرار سے اُردو میں بھی کہنا شروع کی۔ اور اس قدر کمال حاصل کر لیا کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے اُردو کلام کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ موجودہ زمانے کے بہت سے باکمال شاعر اب تک ان کی تقلید کرتے ہیں۔

مرزا نے شاعری کی دوسری قسموں (قصیدہ وغیرہ) کی طرف بھی توجہ کی ہے مگر اُنھیں سب سے زیادہ کامیابی غزل میں ہوئی وہ صرف شاعر ہی نہ تھے۔ نثر میں بھی انھوں نے بڑی اچھی اچھی کتابیں اُردو، فارسی میں لکھی ہیں۔ ان کے خطوں کا مجموعہ خاص

اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں اُنھوں نے ایسی اچھی نثر لکھی ہے کہ آج کل کے لوگ بھی اسے پڑھ کر سر دُھنتے ہیں۔ ان خطوں میں، سادگی بے تکلفی، شوخی اور ظرافت سبھی کچھ ہے۔

ان کی تقریباً تمام کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ خصوصاً غزلوں کا انتخاب جسے انھوں نے خود مرتب کیا تھا سینکڑوں بار چھپ چکا ہے جامعہ کے مکتبہ نے اس کا ایک نہایت خوبصورت ایڈیشن جرمنی میں چھپوایا ہے۔ ابھی حال میں ہندوستان کے مشہور مسلمان مصور حضرت چغتائی نے یہ دیوان نہایت ہی اعلیٰ پیمانہ پر باتصویر شائع کیا ہے۔ اس دیوان کی ۸۰-۹ شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور اب تک سلسلہ جاری ہے۔

مرزا کے کلام کی خود ان کے زمانے میں بہت قدر ہوئی پھر بھی اتنی نہیں ہوئی جتنی انھیں توقع تھی اسی لئے انھوں نے فارسی میں کہا ہے کہ "شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن" یعنی میرے کلام کی شہرت اور قدر میرے مرنے کے بعد ہوگی اور یہ اُنھوں نے بالکل صحیح کہا تھا۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے ان کے کلام کی مقبولیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔

Sayid Ahmad Khan Rahmat...

سیّد احمد خاںؒ

قوموں کے دن جب اچھے ہوتے ہیں تو ان میں اچھے آدمیوں کی کمی بھی نہیں ہوتی۔ قوم کی ترقی سے صلاحیت والے آدمیوں کے جوہر چمکتے ہیں۔ اور ان آدمیوں کی وجہ سے قوم اور ترقی کرتی ہے مگر جب قومی زندگی کا شیرازہ بکھرتا ہے تو سنبھالنے والے کم ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں مغل حکومت کے زوال کے بعد قومی زندگی بالکل تتر بتر ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد تو معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں کا وجود قومی شاید اس ملک سے مٹ ہی جائے مگر قوم میں زندگی کا شاید کچھ شمّہ باقی تھا کہ بعض لوگ اس بپتا میں اسے سہارا دینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے سردار سید احمد خاں تھے۔

سید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ یہ

حسینی سید تھے ان کا خاندان عرب سے ایران اور ایران سے شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان کے دارالسلطنت دلی میں آیا۔ ان کے والد میر متقی پیراکی اور تیر اندازی میں ماہر تھے۔ سید صاحب نے بھی یہ فن اُن سے سیکھا۔ ان کے نانا خواجہ فریدالدین احمد احب علم بزرگ تھے۔ ان کا شاہی خطاب عارف الدولہ امین جنگ تھا۔

سید احمد خاں کی تربیت زیادہ تر اپنی والدہ کی نگرانی میں ہوئی۔ یہ بڑی نیک اور سمجھ دار بی بی تھیں۔ یہ ان ہی کی تربیت کا اثر ہے کہ سید صاحب نے ملک اور قوم کی اتنی بڑی بڑی خدمتیں انجام دیں ایسے اچھے اچھے کام کئے اور اس قدر نام پیدا کیا۔

سید احمد خاں بچپن میں بہت تیز تھے اور بلا کے ذہین اور شریر۔ ان کے کھیل کود پر ماں نے کوئی پابندی نہیں عائد کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جو چاہو کھیلو مگر کوئی کھیل ہم سے چھپا کر نہ کھیلو۔ سید صاحب اپنے ہمجولیوں اور ساتھیوں کے ساتھ خوب کھیلتے کودتے اور شرارتیں کیا کرتے۔

جب بسم اللہ ہو گئی تو پڑھنے بٹھائے گئے۔ قرآن شریف کے بعد فارسی اور پھر عربی شروع کی۔ عربی کی تھوڑی کتابیں پڑھی تھیں کہ ریاضی کا شوق ہوا جو ان کا خاندانی علم تھا۔ اپنے ماموں سے بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں پھر طب کی طرف توجہ ہوئی

ایک خاندانی طبیب سے طب کی کچھ کتابیں پڑھیں اور حکیم کے ساتھ بیٹھ کر مطب بھی کیا۔ آخر ۱۸۔۱۹ سال کی عمر میں لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا۔ لیکن کتابوں کا مطالعہ برابر جاری رکھا۔ ۲۲ برس کی عمر میں جب اُن کے والد کا انتقال ہوگیا تو ملازمت کی فکر ہوئی۔ اپنے ایک خالو کے ذریعے دفتر میں کام سیکھنا شروع کیا۔ تھوڑے دنوں بعد سر شتے دار ہو گئے۔ اور ججی تک ترقی کی۔

سید احمد خاں کو اپنی تعلیم کے ادھورا رہ جانے کا احساس تھا۔ دہلی میں منصف ہو کر آئے تو پچھلا پڑھا ہوا دہرایا۔ آگے کی کتابیں یہاں کے علما سے پڑھیں اور اس طرح اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔

اسی زمانے میں بہادر شاہ نے انھیں جوادالدولہ عارف جنگ کا خطاب عنایت کیا۔ یہ ان کا موروثی خطاب تھا۔ ان کے نانا کو بھی یہی خطاب ملا تھا۔ اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید بھی اُنھوں نے اسی زمانے میں لکھی جس میں دلی کی پرانی تاریخی عمارتوں کے حالات ہیں ۱۸۶۱ء میں اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اسی ترجمے کو دیکھ کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے جو ایک معزز علمی انجمن ہے اپنا فیلو منتخب کیا۔

۵۷ء کے انتشار کا مشہور واقعہ پیش آیا ہے تو وہ انگریزی عہدے دار کی حیثیت سے بجنور میں تھے اس وقت انھوں نے

بہت سے انگریزوں کی جان بچانے کی کوشش کی۔ اس سے ان کی عزت اور رسوخ انگریزوں میں بہت بڑھ گیا۔ اس رسوخ سے وہ اپنی ذات کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ بہت سے مسلمانوں کو قتل و بربادی سے بچایا۔

۱۸۵۹ء میں سید احمد خاں صدر الصدور ہو کر مراد آباد گئے۔

۱۸۵۹ء میں بغاوت کے سلسلے میں ایک تحقیقاتی کمیشن بیٹھا تھا۔ اس میں سب انگریز تھے ہندوستانیوں میں صرف سید احمد خاں تھے۔ یہیں اُنھوں نے "تاریخ سرکشی بجنور" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی اس میں بجنور کی بغاوت کا حال تاریخ وار لکھا ہے۔

مراد آباد میں اب تک کوئی مدرسہ نہ تھا۔ سید احمد خاں نے ایک فارسی مدرسہ قائم کیا کچھ دنوں بعد وہاں تحصیلی قائم ہوا تو یہ اس میں ملا دیا گیا۔ اپنا مشہور رسالہ "اسباب بغاوت ہند" بھی اُنھوں نے یہیں لکھا۔ اس میں اُنھوں نے مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کیا ہے۔ انگریزوں کے خلاف جو الزام لوگوں نے لگائے ہیں وہ بیان کئے ہیں اور انگریزوں نے مسلمانوں پر جو الزام لگائے ہیں اُن کی تردید کی ہے۔

۱۸۶۰ء میں یوپی میں قحط پڑا جگہ جگہ محتاج خانے قائم کئے گئے۔ مراد آباد کے محتاج خانے کا انتظام سید احمد خاں کے سپرد

کیا گیا۔ اُنھوں نے یہ کام بہت خوش انتظامی کے ساتھ انجام دیا۔ ۱۴ ہزار محتاج روز کھانا کھاتے تھے اور گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا۔ ۱۸۶۱ء میں اُن کا تبادلہ مراد آباد سے غازی پور ہو گیا۔ یہاں ۱۸۶۳ء میں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن قائم کی اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسری زبانوں سے سائنس اور دوسرے علوم و فنون کی کتابوں کا دیسی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اسی سال یہاں ہندو مسلمانوں کا ایک انگریزی مدرسہ بھی قائم کیا جو وکٹوریہ ہائی اسکول کے نام سے اب تک قائم ہے۔ ۱۸۶۴ء میں ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا وہ سوسائٹی کو بھی اپنے ساتھ علی گڑھ لے آئے یہاں اس انجمن نے بہت ترقی کی اس کی ایک شان دار عمارت بھی تیس ہزار کی لاگت سے بن گئی۔ بہت سی کتابوں کے ترجمے بھی شائع ہوئے۔ اور اس کی طرف سے ایک اخبار بھی نکلنے لگا۔

۱۸۶۷ء میں وہ جج بنا کر بنارس بھیج دئے گئے یہاں اُنھوں نے ہومیوپیتھک طریق علاج پر غور کیا۔ یہ اُنھیں پسند آیا تو بہت شدت سے اس کے حامی بن گئے۔ اس لئے کہ اُنھیں جو چیز بھا جاتی اس کا پورا ساتھ دیتے تھے۔ طبیعت میں کام کا ولولہ تھا۔ زبانی ہمدردی پر بس نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک شفا خانہ قائم کیا اور ایک کمیٹی بنائی جس کے سکرٹری خود ہوئے۔

۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے۔ دونوں صاحب زادے بھی ساتھ

تھے۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک اعلیٰ درجے کا تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ سفر انگلستان کا مقصد یہ تھا کہ وہاں کی تعلیم گاہوں کے اصول تعلیم کا مطالعہ کریں علاوہ اس کے ایک انگریز سر ولیم میور نے (جو یوپی کا لفٹنٹ گورنر بھی رہ چکا تھا) اپنی کتاب میں آں حضرتؐ کے بارے میں بہت سی غلط باتیں لکھ دی تھیں۔ سید صاحب اس کتاب کا جواب انگریزی میں لکھوانا چاہتے تھے۔ انگلستان میں سید صاحب کوئی ایک سال پانچ مہینے رہے اس عرصے میں انھوں نے دوسرے مشغلوں کے علاوہ اپنی کتاب خطبات احمدیہ کو پورا کیا۔ اور اس کا خلاصہ انگریزی میں چھپوایا اس کے علاوہ وہاں کی تعلیم گاہوں خصوصاً کیمبرج کا بہت غور سے مطالعہ کیا۔ انگلستان میں ان کی بہت آؤ بھگت کی گئی۔ اور وہاں کی علمی وفنی ترقیاں دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔

۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپسی ہوئی۔ ہندوستان میں آتے ہی انھوں نے اس کام کی ابتدا کر دی جس کے لئے انھوں نے ولایت کا سفر کیا تھا۔ یعنی ایک اعلیٰ تعلیم گاہ کا قیام دسمبر ۱۸۷۰ء میں انھوں نے مسلمانوں کے خیالات میں اصلاح کی غرض سے اپنا مشہور پرچہ "تہذیب الاخلاق" نکالا۔ مسلمانوں نے اس پرچے کی مخالفت کی لیکن یہ مخالفت پر بھی اسے استقلال سے نکالتے رہے اور اس میں اپنے تجویز کئے ہوئے اسلامی مدرسے

کی ضرورت پر پڑھنے والوں کو برابر توجہ دلاتے رہے۔ بہت سے سمجھ دار لوگ اُن کی اس تجویز کے موافق ہو گئے۔ آخر خدا خدا کر کے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ابتدائی مدرسہ قائم ہوا اور ۱۸۷۷ء میں کالج کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔ اس کالج نے جیسی کچھ ترقی کی وہ سب سید صاحب کی نیک کوششوں کا پھل ہے۔

Morlana Halee

مولانا حالی

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء میں قصبہ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والدین کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا بڑے بھائی بہنوئی نے ان کی تعلیم و تربیت کی پہلے قرآن حفظ کیا پھر فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور عربی صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ ابھی تعلیم کا سلسلہ یہیں تک پہنچنے پایا تھا کہ ۱۷ سال کی عمر میں بھائی کے اصرار سے مجبور ہو کر شادی کر لی۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ تعلیم کا سلسلہ ختم کیا جائے اور نوکری کی جائے۔ لیکن خواجہ صاحب تعلیم کو اس طرح ادھورا نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ چھپ چھپا کر کسی طرح دلی پہنچے اور ڈیڑھ برس تک وہاں عربی پڑھتے رہے۔ لیکن عزیزوں کے اصرار سے پھر چھوڑ کر پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہاں برس ڈیڑھ برس بیکار رہے اس زمانے میں کتابوں کا مطالعہ برابر جاری رہا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے ہندو مسلمانوں

ستے غلامی کے احساس سے مجبور ہو کر اپنے نئے آقاؤں کو دیس سے نکالنا چاہا۔ لیکن نہ تو ان میں اتنی طاقت تھی اور نہ اتنی تنظیم اسی لئے وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے اور انگریزوں نے انھیں بری طرح کچلا۔ ہزاروں خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔ غرض یہ ہنگامہ شروع ہوا تو مولانا حالی نوکری چھوڑ کر پانی پت آ گئے۔ اور چار برس تک بیکار رہے اس زمانے میں پانی پت کے مشہور عالموں سے منطق فلسفہ اور تفسیر و حدیث پڑھتے رہے۔ اپنے طور پر بھی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا۔ ۱۸۶۳ء میں جہانگیر آباد کے مشہور رئیس نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی کے یہاں ان کے بچوں کی نگرانی اور تعلیم پر مقرر ہوئے۔ سات برس کے بعد نواب صاحب کا انتقال ہو گیا تو لاہور میں سرکاری ملازمت مل گئی یہاں کام یہ تھا کہ انگریزی کتابوں کے اُردو ترجموں کی اصلاح کریں۔ لاہور میں چار سال رہنے کے بعد دلی کے اینگلو عربک ہائی اسکول میں ملازم ہو گئے۔ غالباً ۱۸۷۶ء میں ان کی ملاقات سرسید مرحوم سے ہوئی۔ مولانا پر سرسید کے خلوص اور قومی ہمدردی کا بہت اثر ہوا۔ دل و جان سے ان کے کاموں میں شریک ہو گئے اور اخیر دم تک ساتھ دیا۔ مشہور مسدس اور علی گڑھ کالج کے سلسلے میں بہت سی نظمیں انھوں نے سرسید ہی کی فرمائش پر لکھیں۔ ۱۸۸۸ء میں انھیں حکومت نظام کی طرف سے پچھتر روپیہ مہینہ ملنے لگا۔

اور مولانا عربک کالج سے علیحدہ ہو گئے۔ چار سال کے بعد اس وظیفہ میں پچیس اور بڑھ گئے۔ مولانا کا وقت اب قومی کاموں اور لکھنے پڑھنے میں زیادہ صرف ہوتا تھا انھوں نے سرسید کے کاموں میں بھی ان کو ہر طرح کی مدد کی وہ ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوتے اور اپنی پُراثر نظمیں پڑھتے۔ خاص اپنے شہر سے سرسید کے لئے تین ہزار روپیہ چندہ کیا۔ علی گڑھ کالج کے وہ سرگرم ٹرسٹی تھے اور اُنھوں نے اس کی ترقی کے لئے دوسروں سے کم کام نہیں کیا۔ یوں سمجھو کہ اس کالج کی انھوں نے کوئی چالیس سال تک خدمت کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے پانی پت میں انگریزی کا ایک اسکول کھولا جو بہت ترقی کر کے ہائی اسکول ہو گیا لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک زنانہ مدرسہ کھولا۔ اور ایک لائبریری قائم کی۔ ۱۹۰۴ء میں حکومت نے علمی، تعلیمی اور قومی خدمات کے صلے میں شمس العلما کا خطاب دیا۔ ۱۹۰۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے صدر مقرر ہوئے۔

عمر کے آخر حصہ میں کچھ تو بڑھاپے کی وجہ سے اور کچھ مختلف امراض کے غلبے سے بہت کمزور ہو گئے تھے۔ آخر ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء (محرم ۱۳۳۳ھ) کو ۷۷ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا کی زندگی کا یہ بہت مختصر سا خاکہ ہے۔ پھر بھی اس بزرگ

ہستی کے علمی شوق، شاعرانہ کمال، قومی درد، اور علمی وتعلیمی خدمات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے نوجوانی کے زمانے میں جب وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے تو انھیں کیسی کیسی دقتیں پیش آئیں اُن کی سرپرست تعلیم کے مخالف تھے لیکن خود اُنھیں علم حاصل کرنے کی سچی لگن تھی اس لئے کسی دقت اور رکاوٹ کی پروانہ کی اور باقاعدہ ورنہ بے قاعدہ پڑھتے رہے اور اس طرح عربی، فارسی میں بہت اچھی استعداد پیدا کر لی۔ خوش قسمتی سے شروع ہی میں اُنھیں غالب وشیفتہ جیسے بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی جس سے ان کی شعروشاعری کی صلاحیتوں کو ابھرنے اور علمی وادبی ذوق کو سنوارنے کا موقع ملا۔ پھر لاہور میں حضرت آزاد کی صحبت اور انگریزی ادب سے واقفیت نے ان کے شاعری اور ان کے علمی وادبی مشغلوں کا رُخ بدل دیا۔ اُن کی بعض بہترین نظمیں "چپ کی داد" "مناظرۂ رحم وانصاف" "برکھارُت" "نشاط امید" "حب وطن" وغیرہ اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہیں۔ سرسید علیہ الرحمۃ کی ملاقات کے بعد قومی درد اور اصلاح ملی کے احساسات سے ان کا دل لبریز ہو گیا۔ اور انھوں نے اپنی پردرد نظموں، عالمانہ تصنیفوں۔ اور سرگرم جدوجہد کے ذریعے قیمتی خدمات انجام دیں۔ سرسید مرحوم کی فرمایش سے جس وقت انھوں نے اپنا مشہور مسدس شایع کیا ہے تو سارے ملک میں آگ سی لگ گئی۔ مسلمانوں کو صحیح طور

پر اپنی پست حالی کا احساس اسی کتاب کے درد بھرے شعروں سے ہوا۔ اسے شائع ہوئے پچپن چھپن سال گذر چکے ہیں لیکن آج بھی اس کی مقبولیت کا وہی عالم ہے۔ خود سرسید اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اس کو میں اپنے اُن اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا۔ میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں"

مسدس کے علاوہ آپ کی اور بھی اچھی اچھی نظمیں غزلیں قطعے اور رباعیاں ہیں جو ان کے مجموعۂ نظم میں چھپ گئی ہیں اُردو کے علاوہ اُنھیں فارسی شاعری پر بھی پوری قدرت تھی عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔ نثر میں بھی اُن کا ایک خاص رنگ تھا جو ان ہی نے ایجاد کیا تھا۔ سب سے پہلے ۱۸۶۸ء میں ایک عیسائی کی کتاب کے رد میں تریاق مسموم کے نام سے ایک کتاب لکھی پھر جیالوجی کی ایک کتاب کا عربی سے ترجمہ کیا۔ عورتوں کے لئے مجالس النسار کے نام سے ایک کتاب لکھی جس پر گورنمنٹ کی طرف سے پانسو روپیہ انعام ملا۔ یہ بہت عرصہ تک پنجاب اور اودھ کے لڑکیوں کے مدرسے میں جاری رہی۔ پھر حیات سعدی کے نام سے سعدی شیرازی کے حالات شائع کئے۔ پھر شاعری پر ایک مفصل مقدمہ لکھا جو ان کا ایک

نہایت ہی اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ مقدمہ اُن کے دیوان کے ساتھ اور الگ بھی شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے یادگار غالب کے نام سے مرزا غالب کے حالات لکھے ہیں اس میں ان کی شاعری پر تنقید اور کلام کا انتخاب بھی ہے۔ ان کا آخری عمر کا کارنامہ حیات جاوید کی تصنیف ہے۔ یہ سرسید علیہ الرحمۃ کی سوانح عمری ہے اس میں سرسید کی زندگی اور اُن کی قومی خدمتوں کے مفصل حالات ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ انھوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں جو تہذیب الاخلاق اور دوسرے اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے مقالات حالی کے نام سے اُن کے مضامین کا مجموعہ حال ہی میں شائع کیا ہے۔

اس فضل وکمال کے ساتھ ساتھ عادات واخلاق میں آپ ہی اپنی مثال تھے۔ طبیعت میں متانت وسنجیدگی۔ کبھی کوئی لغو بات یا بے ہودہ کلمہ منہ سے نہیں نکالا دوسروں کی برائی اور غیبت خود کرتے تھے نہ دوسروں سے سننا پسند کرتے تھے ہر شخص کے خیر خواہ اور ہمدرد۔ دوسروں کے کام آنا اور لوگوں کو نفع پہنچانا ان کی زندگی کا بہترین شغل تھا۔ اعتدال میانہ روی اور انصاف پسندی طبیعت کے خمیر میں تھی اپنی عزیزوں

اور اولاد سے بہت محبت تھی ان کی تعلیم کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ قوم کے بچوں اور بچیوں کے لئے جو کچھ کیا اس کا حال ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ نہایت بے نفس، مخلص اور فراخ دل تھے تعصب نام کو نہ تھا۔ قناعت کا یہ حال تھا کہ جب حیدرآباد سے وظیفہ ہو گیا تو عربک اسکول کی ملازمت چھوڑ دی اور عمر بھر اسی قلیل رقم پر گذر کرتے رہے۔ قومی ہمدردی کا یہ حال تھا کہ جنگ بلقان کے زمانے میں مسلمانوں کے کشت و خون کی خبریں سنتے تھے تو بے اختیار دل سے آہ نکل جاتی تھی۔ جیسے اپنے کسی عزیز کے مرنے کا غم ہو اس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں صاحب نے بلقان کے مظلوموں کی ہمدردی و اعانت میں بہت کام کیا۔ مولانا نے ان کی تعریف میں بہت پرجوش نظم لکھی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو ان کی خدمت میں کچھ عجیب طرح کا دماغی سکون اور روحانی کیف حاصل ہوتا تھا۔ اور آج بھی کہ وہ ہم میں نہیں ہیں ان کا کلام اور اُن کی تصنیفیں قوم کی تربیت کے لئے موجود ہیں۔ ان کے ایک ایک بول میں حالی کی شخصیت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ان کی سچائی اور سادگی، متانت اور خلوص نے جس طرح ان کی شخصیت کو اپنے زمانہ میں یکتا بنایا تھا اسی طرح آج یہ صفتیں ان کی

تحریروں میں جھلکتی اور ہر سچے طالب کی ذہنی اور روحانی نشو ونما کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔ خوش قسمت ہے وہ قوم جس کے پاس ایسی سنہری زندگیوں کی یاد ہو اور ان سے اپنی حالت سدھارنے کا سامان۔

سید جمال الدین افغانیؒ

سید جمال الدین افغانی کے باپ کا نام سید صفدر علی تھا نسب کا سلسلہ حضرت حسین علیہ السلام سے ملتا ہے۔ ماں بھی سید تھیں خاندانی وطن ایران ہے مگر سید صفدر علی افغانستان میں آ رہے تھے۔ سید صاحب یہیں شعبان ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بچپن ہی میں تفسیر، حدیث اور دوسرے علوم میں کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔ یہ علم انھوں نے قزوین میں حاصل کئے یہاں سے وہ طہران گئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہندوستان آئے اور ڈیڑھ سال تک قیام کیا۔ اس عرصے میں انھوں نے مغربی (یورپ کے) علوم و فنون سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا کی۔ اور یہیں انھیں سیاست کی باتوں سے دلچسپی ہو گئی۔ ہندوستان سے حج کی غرض سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور ایک سال کے بعد افغانستان واپس آئے۔ اس وقت کی افغانی حکومت

نے اُنھیں ایک اچھے عہدہ پر ملازم رکھ لیا۔

کچھ عرصے کے بعد دوبارہ سید صاحب کو مکے اور مدینے کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور ہندوستان کے راستے سے حجاز تشریف لے گئے۔ راستے میں ایک مہینے کے لئے قاہرہ میں بھی ٹھیرے اور وہاں کے عالموں سے ملاقاتیں اور علمی بحثیں رہیں حج سے فارغ ہونے کے بعد قسطنطنیہ تشریف لے گئے ترکی حکومت نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا مگر شیخ الاسلام کو جو ایک پرانے خیال کا عالم تھا ان سے کد ہوگئی اور کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ آخر انھیں یہاں سے نکلنا پڑا اور قاہرہ تشریف لے گئے۔ مصری حکومت نے ان کی علمی لیاقت سے متاثر ہوکر وظیفہ مقرر کر دیا یہاں سید صاحب نے پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا دور دور کے طالب علم ان سے علم حاصل کرنے کے لئے آتے۔ محض ان کی وجہ سے تھوڑے دنوں میں مصر میں علم کا چرچا ہو گیا۔ یہ ان ہی کی برکت تھی کہ ذرا سی مدت میں مصر میں ایسے زبردست رہنما پیدا ہو گئے کہ انھوں نے مصر کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یہاں بھی پرانے خیال کے مولوی اُن سے ناراض ہو گئے ادھر انگریزی حکومت بھی انھیں خطرے کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے موقع پاکر انھیں مصر سے خارج کرا دیا۔ یہاں سے وہ ہندوستان تشریف لائے اور حیدرآباد دکن میں قیام کیا۔

اسی زمانے میں مصر میں شورش پیدا ہوگئی۔ مصری حکومت اور انگریزوں کا خیال تھا کہ اس شورش میں سید صاحب کا ہاتھ ہے اس لئے انھیں کلکتے میں نظر بند کر دیا اور جب شورش ختم ہوگئی تو ہندستان سے باہر نکال دیا۔ سید صاحب یہاں سے لندن اور لندن سے امریکہ تشریف لے گئے امریکہ میں دو تین مہینے رہ کر پھر لندن واپس آئے۔ لندن سے پیرس گئے۔ اور تین سال تک مقیم رہے یہیں سے انھوں نے اپنا مشہور رسالہ العروۃ الوثقیٰ کے نام سے نکالا جس میں انگریزوں کی بہت شدت سے مخالفت کی۔ یہاں سے وہ پھر لندن گئے۔ لیکن انگریزی حکومت نے ان سے کچھ اچھا سلوک نہ کیا اور اُن کے ارادوں میں حائل ہوئی۔ جس کی وجہ سے وہ روس کے ارادے سے روانہ ہوگئے تاکہ انگریزی حکومت کے خلاف اسلامی حکومتوں اور روس میں اتحاد کرائیں۔ مگر شاہ ایران کے بلانے پر ایران چلے گئے ایران کا بادشاہ ان کی صاف بیانی سے بہت جلد ناراض ہوگیا اور انھیں ایران سے نکلوا دیا۔

یہاں سے نکالے جانے کے بعد سید صاحب روس پہنچے یہاں کے مسلمانوں کی حالت کچھ اچھی نہ تھی اور حکومت کی طرف سے ان پر بہت سی پابندیاں تھیں۔ سید صاحب نے اپنے اثر سے کام لے کر پابندیاں دور کرا دیں۔ یہاں سے وہ

جرمنی گئے اور جرمنی سے پھر طہران آئے۔ اس مرتبہ ایران کے بہت سے سمجھدار لوگ بادشاہ کی مخالفت میں اُن کے ساتھ ہو گئے۔ اور بادشاہ نے سخت بیماری کی حالت میں انھیں بڑی ذلت کے ساتھ اپنے ملک سے نکلوا دیا۔ سید صاحب یہاں سے بصرہ پہنچے اور وہاں سے اپنی صحت کی درستی کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ یہیں سے اُنھوں نے ایک عربی اور انگریزی اخبار نکالا مگر انگریزی حکومت نے اسے بند کرا دیا پھر یہاں سے وہ سلطان عبدالحمید کے بلانے پر قسطنطنیہ تشریف لے گئے اسی زمانے میں ان کے ایک ایرانی شاگرد اور معتقد نے ایران کے ظالم بادشاہ کو قتل کر دیا۔ ایران کی حکومت نے سید صاحب پر بھی شبہ کیا مگر اُسے کوئی ثبوت نہ مل سکا۔

سلطان عبدالحمید نے پہلے تو سید صاحب کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا مگر بعد میں اُن کا مخالف ہو گیا اُس کی ناراضگی کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی اُن سے کھنچنے لگے۔ مگر سید صاحب اب کسی دوسری جگہ تشریف نہیں لے گئے آخر رجب ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء میں سرطان کے مرض میں مبتلا ہوئے اور تین مہینہ بیمار رہ کر اسی سال ۵ رشوال کو انتقال کیا۔

سید صاحب ایک غیر معمولی شخصیت کے انسان تھے وہ عربی اور فارسی علوم کے فاضل تھے۔ یورپ کی کئی زبانیں جانتے

تھے۔ تقریر میں جادو تھا ایک ایک لفظ دل میں اُتر جاتا تھا۔ تحریر میں بھی یہی رنگ تھا۔ آنکھوں میں مقناطیسی قوت تھی جو دشمن کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی تھی گفتگو میں ایک خاص اثر ہوتا تھا۔ طبیعت میں بے انتہا بے نیازی اور خودداری تھی۔ عزت اور دولت حاصل کرنے کے بہت سے موقع آئے مگر سید صاحب نے کبھی ان کی پروا نہ کی۔ مذہبی تعصب کی ذرا بھی جھلک نہیں پائی جاتی تھی۔ شیعہ سنی ان کے نزدیک سب برابر تھے۔ بہت سے ایرانی عالم اُن کے معتقد تھے۔ اور اُن پر جان قربان کرنا معمولی بات سمجھتے تھے اسی طرح بہت سے کٹر سنی مفتی عبدہٗ وغیرہ اُن کے عزیز ترین شاگرد تھے۔

سید صاحب کل ساٹھ برس زندہ رہے۔ بچپن اور طالب علمی کے زمانہ کے علاوہ ان کی ساری عمر اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کے لئے دوڑ دھوپ میں گزری۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔ اُن کے پاس نہ دولت تھی نہ علم تھا نہ حکومت جو اسلامی حکومتیں بچی کھچی رہ گئی تھیں وہ بہت کمزور تھیں۔ سید صاحب نے ان حالات کو بہت غور سے دیکھا اور اصل مرض کو پہچان لیا اور اُس کے علاج کے لئے اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ اس زمانے میں ہر اسلامی ملک میں کچھ سمجھ دار لوگ پیدا ہوگئے تھے جنھیں اپنی پستی اور اپنی کمزوریوں کا احساس پیدا

ہو گیا تھا اور وہ مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کمربستہ ہو گئے تھے
مگر اُن کی کوششیں اپنے اپنے ملکوں تک تھیں لیکن سید صاحب
تمام دنیا کے مسلمانوں کی بھلائی چاہتے تھے۔ اپنی ان کوششوں
میں سید صاحب کو بڑی دقتیں اُٹھانی پڑیں یورپ کی حکومتیں
تو ایک طرف خود اسلامی حکومتیں ان کی دشمن ہو گئیں لیکن سید
صاحب باوجود ان دقتوں اور سخت مشکلوں کے ہمیشہ اپنے
ارادوں میں مستقل رہے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے مخلص اور
سمجھدار مسلمانوں میں اُنھیں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور وہ
صحیح معنوں میں تمام دنیا کے مسلمانوں کے رہنما تسلیم کئے گئے۔

محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء یا ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی محمد باقر صاحب اخبار نویس تھے۔ انھوں نے دلی میں اردو کا پہلا اخبار نکالا تھا اس زمانے کے مشہور شاعر استاد ذوق سے مولوی محمد باقر صاحب کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ مولانا آزاد کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ شاعری میں بھی ان ہی کے شاگرد ہوئے اور شاعری کے متعلق اکثر علم ان ہی سے حاصل کیے۔ اس کے بعد دلی کالج میں داخل ہو گئے۔ اور بہت جلد تمام طالب علموں میں ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ اسی زمانے میں استاد ذوق کے ساتھ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ استاد ذوق کی صحبت اور مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے ان کا اردو ذوق بہت نکھر گیا تھا۔ استاد ذوق کے انتقال کے بعد مولانا آزاد یہاں کے ایک اور مشہور شاعر کو اپنی غزلیں دکھاتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دلی تباہ ہوئی تو یہ بھی تباہ ہو گئے۔ ان کے والد اسی زمانہ میں شہید کر دیئے گئے۔ کچھ امن سکون ہوا تو ۱۸۵۷ء کے آخر میں روزگار کی تلاش میں لکھنؤ کا رُخ کیا۔ مگر وہاں تو پہلے ہی بہت جھٹر ہو چکا تھا اس لئے ناکام رہے اور کچھ دنوں اس طرف کی سیر و سیاحت کے بعد واپس آ گئے۔ ۱۸۶۴ء میں لاہور کے محکمۂ تعلیم میں ۱۵ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ اور گھر بار کی فکروں سے کسی قدر نجات ملی۔ یہاں رفتہ رفتہ ان کی قابلیت کے جوہر کھلنے لگے۔ کچھ عرصے بعد ایک اردو اخبار اتالیق پنجاب کے سب ایڈیٹر مقرر کر دیئے گئے۔ اور تنخواہ ۵۰ روپیہ ماہوار بڑھا دی گئی۔ آپ کے زمانہ میں اس اخبار نے حیرت انگیز ترقی کی اور اس کی اشاعت پنجاب کے سب اخباروں سے بڑھ گئی کچھ عرصہ بعد لاہور کے مشرقی زبانوں کے کالج (اورئینٹل کالج) میں فارسی کے پروفیسر مقرر کر دیئے گئے۔ ۱۸۶۵ء میں سرکاری کام سے کلکتہ کا سفر کیا۔ اس کے بعد، کابل، بخارا اور ایران بھیجے گئے ۱۸۸۳ء میں ایران کا دوبارہ سفر کیا ۱۸۸۷ء میں حکومت کی طرف سے شمس العلما کا خطاب ملا۔ کالج سے علیحدہ ہونے پر ۵۰ روپیہ پنشن ملتی تھی۔

۱۸۸۹ء میں کام کی کثرت اور بعض ناقابل برداشت صدموں کی وجہ سے جنون کی علامتیں پیدا ہونے لگیں۔ اور مرض بڑھتا گیا

جوں جوں دوا کی۔ آخر اسی حالت میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو لاہور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ تمام ہندوستان میں ماتم کیا گیا۔ مولانا حالی اور دوسرے شاعروں نے مرثیے اور تاریخی قطعے لکھے۔

مولانا آزاد کی طبیعت میں سادگی بہت تھی لباس بھی سادہ پہنتے تھے۔ بہت ملنسار۔ متواضع، ہنس مکھ اور کشادہ پیشانی تھے گفتگو میں نرمی اور ایک خاص شیرینی تھی۔ شاگردوں سے بہت ہی مخلصانہ تعلقات رکھتے تھے تعلیم کے علاوہ بھی اُن کی امداد و اعانت کو سلئے ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔

ملازمت کے بعد مولانا آزاد کی زندگی کا زیادہ تر حصہ لاہور میں گذرا ہیں انھوں نے ۱۵ روپیہ کی معمولی نوکری سے کالج کی پروفیسری تک ترقی کی اور یہیں کی زمین اُن کی آخری آرام گاہ ہے۔ دلی میں انھوں نے گویا اردو زبان کی گود میں پرورش پائی تھی۔ ذوق جیسے بزرگ اُن کے استاد تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے بڑے بڑے شاعروں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اس لئے اردو کا ذوق اور اردو کی محبت اُن کی رگ رگ میں سما گئی تھی ملازمت ایسی ملی تھی جس میں وہ اپنے علمی و ادبی مشغلے کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکتے تھے۔ یہی اُنھوں نے کیا بھی۔ اردو زبان کی ترقی کے لئے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی اور یہ پنجاب میں مولانا آزاد ہی کی بدولت اُردو زبان نے غیر معمولی ترقی اور

مقبولیت حاصل کی۔ انجمن پنجاب کے قائم کرنے میں اُن کی کوششوں کو بہت دخل ہے۔ پنجاب کے اعلیٰ سرکاری افسروں اور محکمۂ تعلیم کے کارکنوں کو ان ہی نے اردو کی ترقی کے لئے آمادہ کیا۔

اردو میں شاعری صرف غزل تک محدود تھی لوگ اس شاعری سے اکتا گئے تھے۔ علاوہ اس کے انگریزی زبان کی شاعری سے بھی لوگ متاثر ہو رہے تھے۔ مولانا آزاد نے اسے محسوس کیا اور انگریزی شاعری کی تقلید میں ایسی شاعری کی بنیاد ڈالی جس سے اردو کا خزانہ اب تک خالی تھا۔ یہ نیچرل شاعری کہلاتی تھی۔ اور اس میں کسی خاص عنوان پر شعر کہے جاتے تھے مثلاً "برسات" "حُبِ وطن" "رحم وانصاف کا مناظرہ" وغیرہ ان ہی کی تحریک سے انجمن پنجاب کے ماتحت ہر مہینے مشاعرہ کی مجلس ہوتی تھی اس میں بجائے مصرع طرح کے مختلف عنوان دئے جاتے تھے۔ ان مشاعروں میں وہ اکثر اردو ادب اور شاعری پر تقریریں بھی کرتے تھے یہ تقریریں اردو ادب کی جان ہوتی تھیں۔

پرانے اردو شاعروں کے حالات میں اُنھوں نے ایک تذکرہ بھی لکھا، یہ تذکرہ ان کی بہترین تصنیف ہے۔ اگرچہ تاریخی اعتبار سے لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں لیکن زبان وادب اور پیرایۂ بیان کے اعتبار سے اب تک کوئی ایسی اچھی کتاب نہیں لکھی گئی اس کتاب کے علاوہ انھوں نے اور بھی اچھی اچھی کتابیں لکھی ہیں مثلاً سخن دان

فارس، نگارستان فارس، دربار اکبری، نیرنگ خیال، جانورستان سپاک ونماک وغیرہ۔ ان تمام کتابوں میں ایک خصوصیت نمایاں ہے اور وہ عبارت کی شگفتگی، شیرینی اور گھلاوٹ ہے۔ اپنی اس اچھی عبارت کا طرز انھوں نے خود ہی ایجاد کیا تھا۔ بڑے بڑے لکھنے والوں نے کوشش کی مگر وہ ایسا پیارا اور انوکھا انداز پیدا نہ کر سکے۔

مولانا آزاد فارسی میں بھی ماہر تھے۔ طالب علموں کو فارسی سکھانے کے لئے اُنھوں نے کئی کتابیں لکھیں ایران کی موجودہ فارسی زبان اور فارسی محاورے معلوم کرنے کے لئے دو دفعہ ایران کا سفر کیا۔ فارسی زبان کی تاریخ اور فارسی شاعروں کا تذکرہ لکھا اور فارسی صرف ونحو پر ایک کتاب لکھی۔

مولانا آزاد کی ذات اردو زبان کے لئے آبِ حیات سے کم نہ تھی انھوں نے حقیقت میں اردو زبان کو ایک نئی زندگی بخش دی اور اُس کو بہت اونچے درجے پر پہنچا دیا۔

مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی نعمانی مرحوم ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم و تربیت شہر اعظم گڑھ میں ہوئی جہاں آپ کے والد وکیل تھے یہاں سے آپ عربی علم حاصل کرنے کے لئے غازی پور گئے۔ غازی پور سے اعظم گڑھ آئے اور یہاں سے پھر منطق، حدیث اور ادب پڑھنے کے لئے رام پور، سہارنپور اور لاہور کا سفر کیا۔ اور اس زمانے کے مشہور عالموں سے فیض حاصل کیا ۱۹ سال کی عمر میں حج کی غرض سے حجاز گئے اور وہاں کے کتب خانوں سے فائدہ اُٹھایا۔ حج سے واپس آ کر کتابوں کا مطالعہ اور پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ شروع کر دیا اسی زمانے میں اپنے والد کے اصرار سے وکالت کا امتحان پاس کیا مگر اس چیز سے اُن کی طبیعت کو لگاؤ نہ تھا۔ بعد میں کچہری میں امین ہو گئے مگر اس میں بھی طبیعت نہ لگی اور استعفیٰ

دے دیا۔ ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ سرسید ؒ پر ان کی قابلیت کا بہت اثر ہوا۔ اپنے ہی مکان میں انھیں جگہ دی اور اپنا قیمتی کتب خانہ ان کے لئے وقف کر دیا مولانا نے سرسید کی صحبت اور اُن کے کتب خانے سے بہت فائدہ اُٹھایا کئی کئی گھنٹے الماریوں کے پاس کھڑے مطالعہ کرتے۔ تھک جاتے تو زمین پر بیٹھ جاتے اسی زمانے میں اُنھوں نے بہت سے تاریخی رسالے اور نظمیں لکھیں، جنھوں نے ملک میں بہت مقبولیت حاصل کی اور اسی زمانے میں آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ مسلمانوں کے مشہور بزرگوں کے حالات لکھے جائیں چنانچہ خلیفہ مامون عباسی اور امام ابو حنیفہ کے حالات میں المامون اور سیرۃ النعمان کے نام سے دو کتابیں لکھیں۔ اس کے بعد حضرت عمر رضؓ فاروق کے حالات لکھنے کا ارادہ کیا۔ اپنی اس قیمتی کتاب کے لئے مسالہ جمع کرنے کی غرض سے قسطنطنیہ شام اور مصر کا سفر کیا اور وہاں سے واپسی کے بعد دو حصوں میں یہ کتاب لکھی۔

۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کالج سے علیحدہ ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد حیدر آباد میں محکمۂ علوم و فنون کے ناظم مقرر ہوئے۔ یہاں انھوں نے سوانح مولانا روم۔ الغزالی۔ علم الکلام۔ الکلام اور کئی اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھیں۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے چند

عالموں نے " ندوہ " کے نام سے ایک انجمن بنائی، اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ عالموں میں اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے، اور عام مسلمانوں کی اصلاح کی جائے، مولانا بھی بڑے جوش کے ساتھ اس انجمن میں شامل ہوئے — انجمن نے کچھ دنوں کے بعد دارالعلوم ندوہ کے نام سے ایک عربی مدرسہ کھولنے کی تجویز پاس کی۔ اس مدرسے کا خاکہ اور اس کے لئے نصاب تعلیم آپ ہی نے تیار کیا۔ پھر جب حیدر آباد کی نظامت کے عہدے سے علیحدہ ہو گئے تو پورے طور پر اس مدرسے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مستقل طور پر لکھنؤ میں رہنے لگے آپ کے زمانے میں اس مدرسے (دارالعلوم) نے بڑی ترقی کی مگر ندوے کی انجمن کے چند ممبروں کی پیہم مخالفت سے بد دل ہو کر آپ اس سے بالکل علیحدہ ہو گئے۔ مضامین عالمگیر اور شعر العجم جیسی مشہور کتابیں آپ نے اسی زمانے میں لکھیں۔

اپنی زندگی کے آخری حصہ میں وہ آں حضرت صلعم کی سیرۃ سیرۃ النبی کے نام سے لکھنا چاہتے تھے مگر صرف دو جلدیں پوری کر پائے تھے کہ ۵۷ برس کی عمر میں ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اعظم گڑھ میں انتقال کر گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا شبلی مرحوم کی زندگی کا تمام تر حصہ علمی، ادبی اور تعلیمی خدمت میں گذرا۔ تمام علوم و فنون پر انھیں یکساں قدرت

تھی۔ لیکن تاریخ کے علم میں غیر معمولی کمال پیدا کیا تھا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے بزرگ جن کے صرف ناموں کو ہم جانتے تھے مولانا کی بدولت ہم اُن کے پورے اور صحیح حالات سے واقف ہوئے۔

مولانا کا سارا وقت کتابوں کے مطالعے، تصنیف و تالیف علمی بحثوں یا اسلامی و قومی کاموں میں گزرتا تھا صرف ان ہی لوگوں سے ملنا پسند کرتے تھے جن میں کوئی علمی و ادبی شوق موجود ہو۔ ان کی صحبت میں جاہلوں کی سی یا غیر علمی گفتگو نہیں ہو سکتی تھی۔ علمی تحقیق اور تلاش و جستجو کا چسکا شروع سے تھا۔

روزانہ زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی صفحے لکھتے تھے۔ لیکن جو کچھ لکھتے تھے بہت تلاش و تحقیق کے بعد۔ تاریخ کے علاوہ انھوں نے دوسرے علموں پر بھی اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی ہیں اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی ان کی تصانیف موجود ہیں۔ شاعر بھی بہت اچھے تھے اردو، اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

حکیم اجمل خاں

دہلی میں حکیموں کا ایک نامی گرامی گھرانا ہے۔ "شریفی خاندان" اس گھرانے کے اکثر بزرگ بڑے حاذق طبیب ہوئے ہیں اور ہندوستان بھر میں اپنی تشخیص و علاج کے لئے نیک نام ہیں، حکیم اجمل خاں صاحب ۱۸۶۴ء میں اسی خاندان میں پیدا ہوئے تعلیم بزرگوں کی نگرانی میں گھر ہی پہ ہوئی طب کی کتابیں اپنے والد حکیم محمود خاں صاحب اور بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے پڑھیں۔ پھر اپنی ذہانت، شوق اور محنت کی بدولت وہ کمال حاصل کیا کہ تھوڑے ہی دنوں میں تمام ہندوستان میں مشہور ہوگئے۔ دور دور سے لوگ علاج کے لئے ان کے مطب میں آتے تھے۔ خدا نے ہاتھ میں شفا بھی دی تھی اس لئے لوگوں کا اعتقاد ان کی طرف اور بھی زیادہ ہو گیا۔ بڑے بھائی کے انتقال کے بعد خاندانی مطب بھی ان ہی کے سپرد ہوا۔ یہ

مطب اُن کی خاندانی روایات کے مطابق بہت کامیاب رہا اور ہزاروں لاکھوں بندگان خدا کو ان سے فائدہ پہنچا۔

حکیم صاحب کے دل میں اپنی دیسی دیو نانی طب کی ترقی نیز ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ شروع سے تھا۔ خوش قسمتی سے انھیں اس کا موقع بھی جلد ہی مل گیا ان کے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں صاحب نے طب کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہ ہندوستان میں طب کا پہلا مدرسہ تھا اس سے پہلے لوگ یوں ہی مختلف حکیموں کے پاس بیٹھ کر طب کی کتابیں پڑھ لیتے تھے اور بس۔ حکیم اجمل خاں صاحب مدرسے کے انتظام و ترقی میں دست راست تھے۔ اور بھائی کے انتقال کے بعد تو گویا وہی سب کچھ تھے۔ انھوں نے بہت جلد اس مدرسے کو کالج کے درجے تک پہنچا دیا۔ کالج کی شاندار عمارت ان کی ہمت و کوشش کی بہترین یادگار ہے۔

انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک زنانہ طبیہ اسکول بھی قائم کیا۔ یہ بھی طبیہ کالج کی عمارت میں بہت کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ دواسازی کے فن کو ترقی دینے اور اُسے موجودہ معیار پر لانے کی غرض سے ایک دواخانہ بھی کھولا۔ اس دواخانے میں بالکل نئے طریقوں سے دوائیں بنائی جاتی ہیں۔ اور ہندوستان بھر میں یہ اپنی طرز کا نیا دواخانہ تھا۔ بعد میں انھوں نے اس کی

آمدنی طبیہ کالج کے لئے وقف کردی۔

انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹری طریقۂ علاج بھی ہندوستان میں آیا۔ ڈاکٹر حضرات دیسی طریقۂ علاج کو بہت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اسے دقیانوسی اور فرسودہ سمجھتے تھے تعلیم یافتہ طبقے اور حکومت کی نظر میں بھی اس کی کوئی وقعت نہ تھی۔ بلکہ اُسی زمانے میں ایک قانون بھی بننے والا تھا جس سے دیسی طب اور حکیموں کو بہت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے اس چیز کو محسوس کیا اور طبی کانفرنس کے نام سے حکیموں کی انجمن قائم کی۔ اس انجمن نے بہت مفید کام کئے اور اس کی بدولت دیسی طب کی قدر و وقعت میں بہت اضافہ ہوگیا۔

انھوں نے نئی نئی دواؤں اور جڑی بوٹیوں کے خواص و فوائد معلوم کرنے کے لئے ایک طبی تحقیقاتی شعبہ بھی قائم کیا اور اُسے طبیہ کالج کے ماتحت کردیا۔ یہ شعبہ بہت مفید کام کر رہا ہے۔

ان خدمات کے صلے میں حکومت کی طرف سے اُنھیں حاذق الملک کا خطاب دیا گیا۔ حکومت کے بڑے بڑے افسروں میں ان کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ اس زمانے کے مشہور وائسرائے لارڈ ہارڈنگ سے اُن کے بہت خوشگوار تعلقات تھے۔

حکیم صاحب ملک کی دوسری اصلاحی و تعلیمی تحریکوں میں بھی برابر حصہ لیتے رہتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے وہ سرگرم ٹرسٹی تھے۔

ایجوکیشنل کانفرنس کو اُن کی ذات سے بہت مدد ملی۔ ندوۃ العلماء کے اصلاحی کاموں کے پرجوش حامی تھے۔ بہت سے اداروں کو وہ مالی امداد بھی دیتے تھے۔

گوناگوں مصروفیتوں کے سبب حکیم صاحب کو ملک کی سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کا موقع بہت کم ملتا تھا لیکن ۲۱-۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تحریک زور شور سے شروع ہوئی تو وہ بھی اس آگ میں کود پڑے۔ حاذق الملک کا خطاب حکومت کو واپس کر دیا، سرکاری افسروں سے میل جول کم دیا اور خلافت اور کانگریس کی تحریکوں میں بہت جوش و خروش سے حصہ لینے لگے، اور اپنی سوجھ بوجھ ذہانت اور متانت کی بدولت وہ جلد ہی چوٹی کے لیڈروں میں بھی بہت اونچی جگہ پر پہنچ گئے۔

قومی کاموں میں اس مصروفیت اور انہماک کے سبب اُن کی طبی سرگرمیوں، اُن کے مطب اور اُن کی ہزاروں لاکھوں روپیے کی آمدنی پر اثر پڑا مگر انھوں نے اس کی ذرا بھی پروانہ کی۔

ترک موالات کی تحریک کے زمانے (۱۹۲۱ء) میں مولانا محمد علی مرحوم نے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے مسلمانوں کی ایک آزاد یونیورسٹی قائم کی اس کے قیام کے مشورے میں حکیم صاحب بھی شریک تھے۔ جامعہ کو دہلی میں منتقل کرنے میں بھی ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب کی کوششوں کو بہت دخل ہے

اس وقت حکیم صاحب ہی جامعہ کے امیر[٥] تھے۔ اس زمانے میں جامعہ مالی دشواریوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب اپنی دوسری مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ اس کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی فکر میں بھی منہمک رہتے تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں ان کے سامنے جامعہ ہی کی ترقی و بہبود کا مسئلہ رہتا تھا۔

حکیم صاحب کی زندگی کا یہ بہت مختصر خاکہ ہے۔ وہ بہت خوبیوں کے بزرگ تھے۔ بڑے آدمیوں میں ایسی متوازن زندگی مشکل سے ملے گی۔ وہ بڑے امیروں اور نوابوں کا علاج کرتے تھے۔ اکثر ریاستوں سے بڑی بڑی تنخواہیں مقرر تھیں۔ دہلی سے باہر جانے کی فیس ایک ہزار روپے روزانہ تھی۔ باوجود اس کے مزاج میں غرور یا تمکنت نام کو نہ تھی۔ غریبوں کا علاج بھی اُسی توجہ سے کرتے تھے۔ روزانہ کے مطب میں ہر حیثیت کے لوگ آتے تھے مگر وہ مریضوں کو ترتیب سے دیکھتے تھے بڑے چھوٹے کا خیال نہ تھا۔ غریبوں کو دوا مفت دے دیتے تھے اور اکثر روپے پیسے سے بھی اس کی مدد کرتے تھے۔ دہلی اور آس پاس گھر پر بلوانے کی فیس نہیں لیتے تھے۔ یہ اُن کی خاندانی آن تھی۔ وہ امیروں کے محلوں میں بھی جاتے تھے اور غریبوں کی جھونپڑیاں بھی ان کی توجہ سے محروم نہ تھیں۔ غریبوں کی خدمت

---

[٥] کارکنوں میں امیر جامعہ کا عہدہ سب سے بڑا ہے۔

سے انھیں زیادہ مسرت ہوتی تھی۔

حکیم صاحب کی متانت اور سنجیدگی ضرب المثل تھی کسی نے انھیں ہنستے یا قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا، باوجود اس کے بہت نرم دل تھے۔ اپنے نوکروں سے بھی کبھی کڑوی بات نہیں کی۔ اندازِ گفتگو میں کچھ ایسی نرمی اور کشش تھی کہ مخالف سے مخالف بھی ان کا ہوا خواہ بن جاتا تھا۔ وضع داری بالکل اگلے بزرگوں کی سی تھی۔ کوئی بات وضع داری کے خلاف نہیں کرتے تھے، وہ پرانی تہذیب کا مکمل نمونہ تھے لیکن نئی تہذیب سے انھیں کوئی تعصب نہ تھا ہر اچھی چیز کو قبول کر لیتے تھے۔ وقت کے بہت پابند تھے، ہر کام کے اوقات مقرر تھے، طبیعت میں بہت ہمدردی اور دل سوزی تھی، بہت سے ضرورتمندوں کی علانیہ اور پوشیدہ مدد کرتے تھے۔ کوئی حاجتمند اُن کے در سے خالی نہیں گیا۔

ان کی ہمدردی، دل سوزی اور جذبۂ خدمت کا اندازہ ان دو واقعوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ ایک بار رام پور سے دہلی آ رہے تھے، راستے میں ریل کا انجن اور کئی ڈبے پانی میں گر گئے ان کا ڈبہ اتفاق سے بچ گیا۔ انھیں جگایا گیا تو ننگے سر ننگے پیر نیچے اُترے اور ایک پاس کے باغ میں جا کر مدد کے لئے آدمیوں کو بلایا اور ڈوبتے ہوئے آدمیوں کو نکلوایا جو نکلتے جاتے ان کے پیٹ کا پانی اپنے سامنے نکلواتے۔ بکس میں جتنے کپڑے تھے سب ان غریبوں میں بانٹ دیئے پھر وہ اسی حالت میں پاس کے اسٹیشن پر گئے۔ حکیم صاحب کی اس بر

وقت مدد سے بہت سے لوگوں کی جانیں بچ گئیں۔

ایک دفعہ دہلی میں انفلوئنزا پھیلا بے شمار جانیں ضائع ہو رہی تھیں ایک قیامت کا سماں اور نفسی نفسی کا عالم تھا۔ ایسے نازک وقت میں حکیم صاحب لاریوں میں دوائیاں بانٹتے پھرتے تھے۔ اپنی جان کی اُنھیں ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔

دن رات کی مصروفیت کے سبب حکیم صاحب کی صحت روز بروز خراب ہو رہی تھی آخر ۱۹۲۷ء میں ترسیٹھ سال کی عمر میں یکایک دل کی حرکت بند ہو گئی اور قوم کے اس خادم، ہمدرد اور غمگسار کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ موت کی خبر سے ہندوستان بھر میں تہلکہ مچ گیا ہر شخص کیا ہندو کیا مسلمان اس خبر سے سوگوار تھے۔ سچ ہے جو قوم کے لئے مرمٹتا ہے وہ مخلوق کی خدمت ہی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتا ہے۔ اس سے خدا بھی خوش ہوتا ہے۔ اور مخلوق بھی سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے اور ہمیشہ اُسے اچھائی سے یاد کرتی ہے۔ اور یہی سچی یادگار ہے ایک مخلص خدمت گزار بندے کی۔

مولانا محمد علی

مولانا محمد علی ۱۸۷۸ء میں رام پور کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے، بچپن ہی سے تیزی و ذہانت بلا کی تھی۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول بریلی میں ہوئی۔ پھر علی گڑھ سے نہایت امتیاز کے ساتھ بی اے کیا۔ علی گڑھ میں ان کی طالب علمی کا زمانہ بہت شاندار رہا ہے۔ پھر ولایت گئے اور وہاں اکسفورڈ یونیورسٹی میں بی اے آنرس کیا۔ انگلستان سے واپسی کے بعد کچھ دنوں رام پور میں محکمۂ تعلیم کے افسر رہے، تھوڑے دنوں کے بعد وہاں سے چلے آئے اور ریاست بڑودہ میں ایک اعلیٰ عہدہ مل گیا۔ ملازمت کے زمانے میں وہ بمبئی کے ٹائمس آف انڈیا میں مضمون لکھا کرتے تھے مگر وہ ملازمت کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ قومی خدمت کے لئے اُن کا دل بے چین رہتا تھا۔ آخر ۱۹۱۰ء میں یہاں سے بھی علیحدگی اختیار کر لی اور "کامریڈ" کے نام سے انگریزی میں ایک

ہفتہ وار اخبار نکالا۔ اس اخبار کی بہت دھوم ہوئی۔ بڑے بڑے انگریز اور ہندوستانی اسے بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ دہلی چلے آئے یہاں انھوں نے "کامریڈ" کے ساتھ ساتھ ایک روزانہ اخبار "ہمدرد" بھی نکالنا شروع کیا۔ یہ اخبار بھی بہت مقبول ہوا اور کہا جاتا ہے کہ اس شان کا انگریزی ہفتہ وار اخبار اور اردو کا روزانہ اخبار اب تک نہیں نکل سکا ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنی تنہا کوششوں سے جنگ بلقان کے موقع پر ایک طبی وفد ترکی بھجوایا اور کان پور کی ایک مسجد کے خونین حادثے میں سرگرم حصہ لیا اس کے لئے انگلستان تک گئے اور مسجد مسلمانوں کو واپس دلوائی۔

کچھ دنوں بعد حکومت ان اخباروں کی صاف گوئی نہ برداشت کرسکی اور یہ دونوں اخبار بند ہوگئے اور قومی خدمت کے جرم میں مولانا محمد علی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ چھندواڑے میں نظر بند کردئے گئے یہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا، پانچ سال کے بعد رہا ہوئے تو ملک کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ پنجاب میں حکومت نے بہت ظلم کئے تھے اس کی وجہ سے سارے دیس میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ خلافت کی تحریک بھی بہت زور شور سے جاری تھی۔ مولانا محمد علی رہا ہوتے ہی ان تحریکوں میں شامل ہوگئے اور اپنی افتادِ طبیعت کے مطابق پورے جوش و خروش سے اس میں حصہ لیا۔ تحریکِ خلافت کے سلسلے میں مولانا لندن بھی تشریف لے گئے اور وہاں مسئلہ

خلافت کی پوری وکالت کی۔ لندن سے ناکام واپسی پر پھر ملک کی ان تحریکوں میں سرگرمی سے شامل ہو گئے کانگرس میں ترک موالات کی تحریک منظور ہوئی تو اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے تمام ملک کا دورہ کیا۔ علی گڑھ کالج میں انھیں ناکامی ہوئی تو انھوں نے ایک آزاد یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم کی اور حضرت شیخ الہند مرحوم سے اس کا افتتاح کرایا۔ کانگرس اور خلافت کی تحریکوں کو مولانا کی شرکت سے بے انتہا تقویت پہنچی۔ عوام خصوصاً مسلمان عوام میں اتنی بیداری اُن ہی کی بدولت پھیلی۔ مولانا نے ان قومی خدمتوں کے سلسلے میں بہت تکلیفیں اُٹھائیں، دورے، تقریریں جلسے اور جلوس روزانہ کا شغلہ تھا۔ آرام تو آرام دم لینے کا موقع بھی نہ ملتا تھا کئی بار جیل بھی گئے۔ اس بے غرض اور مجاہدانہ سرفروشی نے اُنھیں عوام میں بے حد مقبول بنا دیا تھا وہ چوٹی کے لیڈروں میں سرگرمی اور عمل کے اعتبار سے قافلہ سالار تھے۔ وہ خلافت کے علاوہ کانگرس کے صدر بھی چنے گئے۔ لیکن بعد میں بعض بڑے بڑے کانگرسی کارکنوں کے طرز عمل سے انھیں اختلاف ہو گیا تھا اس لئے کانگرس کی جدوجہد سے انھوں نے علیحدگی اختیار کر لی تھی تاہم ملکی آزادی کے لئے اُن کے دل میں وہی تڑپ موجود تھی۔ دن رات کام کرتے اور ذیابیطس کے مرض کے سبب اُن کی تندرستی بہت خراب ہو گئی تھی اس مرض کے علاج کے لئے وہ یورپ بھی

گئے مگر کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا آخر ۱۹۳۰ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں سخت بیماری کی حالت میں لندن گئے اور اس مرد مجاہد نے جنوری ۱۹۳۱ء میں وہیں اپنی جاں آفریں کے سپرد کی۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ان کی آخری تقریر ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں زریں حروف میں لکھی جائے گی۔ انتقال کی خبر سے ہندوستان ہی میں نہیں تمام اسلامی ملکوں میں غم کی گھٹا چھا گئی۔ مولانا محمد علی پہلے ہندی مسلمان ہیں جن کا ہندوستان سے باہر اسلامی ملکوں میں اس قدر ماتم کیا گیا۔ مرحوم کی میت فلسطین لائی گئی اور وہیں اُن کی آخری آرام گاہ ہے۔

مولانا محمد علی صحیح معنی میں مرد مجاہد تھے اُن کی مذہبیت اُن کا اسلامی جوش اور مسلمانوں کی ترقی کے لئے اُن کی بے چینی اُن کا خلوص للّٰہیت اور سچائی یہ تمام خصوصیات کسی مسلمان لیڈر میں یک جا نہ ملیں گی۔ وہ اپنے ملک کی آزادی کے معاملے میں بھی اتنے ہی پرجوش تھے اس سلسلے میں ان کی خدمات کسی بڑے سے بڑے وطن پرست سے کم نہیں، لیکن اُنھوں نے اپنے کو وطن پرست کہلانا کبھی پسند نہ کیا، پرستش تو وہ بس ایک خدا کی کرتے تھے اس معاملے میں ان کا نقطہ نظر ذرا زیادہ فراخ دلی پر مبنی تھا وہ خدا کی تمام مخلوق کی بھلائی چاہتے تھے۔ خصوصاً مسلمانوں کی ذرا سی تکلیف سے چاہے وہ کسی ملک کے ہوں اُن کے دل پر چوٹ لگتی تھی۔

انھیں حق بات کہنے میں کبھی باک نہ ہوتا تھا اور جس بات کو وہ صحیح سمجھ لیتے تھے اس کی پرجوش حمایت کرتے تھے۔ اور دوست دشمن کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے ان کی علمی قابلیت باریک بینی گہری نظر اور اردو انگریزی تحریر وتقریر پر یکساں قدرت مسلّم تھی۔ وہ شاعر بھی تھے، اُن کی شاعری چونکہ دل سے نکلتی تھی اس لئے دل پر اثر کرتی تھی۔ غرض ایسی ہمہ گیر شخصیت کے بزرگ قدرت کبھی کبھی پیدا کرتی ہے۔ مولانا آج اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کو اُن جیسے مخلص ایثار پیشہ اور وطن دوست رہنماؤں کی اب پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۸۷۶ء میں پنجاب کے مشہور شہر سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ پھر مدرسے میں داخل ہوئے۔ ذہن اور حافظہ بلا کا پایا تھا۔ پانچویں درجے کے امتحان میں اول رہے اور وظیفہ کے مستحق قرار پائے مڈل اور میٹرک کے امتحان بھی اسی شان سے پاس کئے پھر سیال کوٹ انٹرمیجیٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں ایک استاد مولوی میر حسن تھے۔ عربی اور فارسی کے ماہر انھوں نے اس جوہر قابل پر خاص توجہ کی۔ بہت محنت اور توجہ سے پڑھایا اور ان میں شعر و شاعری اور فارسی زبان کا صحیح ذوق پیدا کر دیا۔ خوش قسمتی سے ان کے والد بھی بہت عقلمند اور دیندار بزرگ تھے۔ انھیں یقین تھا ان کا ہونہار فرزند آگے چل کر بڑا آدمی ہوگا اور ان کی آرزو تھی کہ اقبال صحیح معنی میں مسلمان اور خادم اسلام ہو۔ ڈاکٹر صاحب اپنے دو واقعے خود بیان فرماتے ہیں۔

جب میں صبح اُٹھتا تھا تو روزانہ کلامِ پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اورادو وظائف سے فرصت پاکر آتے اور مجھے دیکھ کر گذر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گذرے تو مسکرا کر فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار دفعہ بتانے کا تقاضا کیا تو فرمایا کہ جب امتحان دے لوگے، تب، جب امتحان دے چکا اور لاہور سے مکان آیا تو فرمایا جب پاس ہو جاؤ گے تب، جب پاس ہو گیا اور پوچھا تو فرمایا بتاؤں گا، ایک دن صبح کو حسبِ دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آئے، اور فرمایا بیٹا کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اُترا ہے، یعنی اللہ تعالےٰ خود تم سے ہم کلام ہے؟

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ باپ نے ایک دن بیٹے سے کہا کہ میں نے تمھارے پڑھانے لکھانے میں جو محنت کی ہے، میں تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ بیٹے نے بڑے شوق سے پوچھا وہ کیا ہے، باپ نے کہا کسی موقع پر بتاؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے ایک دفعہ کہا "بیٹا میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ "تم اسلام کی خدمت کرنا" ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں اس کے بعد میں نے امتحان وغیرہ دے کر اور کامیاب ہو کر لاہور میں کام شروع کیا، ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا پھیلا اور نوجوانوں نے اس کو اسلام کا ترانا بنایا اور دوسری نظمیں لکھیں اور لوگوں نے انھیں ذوق و شوق سے پڑھا اور سُنا اور

سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا تو ان ہی دنوں میں میرے والد موت کے مرض میں بیمار ہوئے میں ان کو دیکھنے کو لاہور سے آیا کرتا تھا، ایک دن میں نے اُن سے پوچھا کہ والد بزرگوار! آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں؟ باپ نے بستر مرگ پر شہادت دی کہ" جان من تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا" ؎۱

اسی اسلامی ماحول میں اقبال کی تربیت ہوئی اور اسی اچھی تربیت نے اُن جیسے ذہین آدمی کو سیدھے راستے سے بھٹکنے نہ دیا اور اُنھیں اسلام کی روح کے سمجھنے میں مدد دی۔

انٹرمیجیٹ کا امتحان پاس کر کے ڈاکٹر اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے وہاں ڈاکٹر ارنلڈ سے فلسفہ پڑھا اور بی اے اور پھر ایم اے کا امتحان بہت امتیاز کے ساتھ پاس کیا، ایم اے کرنے کے بعد اورنٹیل کالج اور پھر گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے، یہاں سے ولایت گئے اور انگلینڈ اور جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لیں اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا، اسی زمانے میں اقبال نے انگلینڈ میں حقیقت اسلام پر چھ تقریریں کیں یہ تقریریں عام طور پر پسند کی گئیں

اسی زمانے میں ان کے استاد پروفیسر ارنلڈ گورنمنٹ کالج لاہور سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہو کر آ گئے تھے۔ وہ یونیورسٹی سے

؎۱ جوہر اقبال مضمون مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ ۱۲

چھ مہینے کی رخصت لینا چاہتے تھے قائم مقامی کے لئے نظر انتخاب اپنے عزیز شاگرد پر پڑی اور ڈاکٹر صاحب اُنکی جگہ چھ مہینے تک پروفیسر رہے۔

انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کچھ عرصہ تک گورنمنٹ کالج میں پروفیسر رہے۔ پھر بیرسٹری شروع کر دی مگر اس کی طرف خاص توجہ نہیں تھی وقت کا زیادہ حصہ غور و فکر اور یا پھر شعر و شاعری میں گذرتا۔ کچھ عرصے کے لئے پنجاب کونسل کے ممبر بھی منتخب ہوئے، اور غریبوں اور مزدوروں کے بہت سے قانون پیش کئے ۲۷ء میں مدراس کی ایک اسلامی انجمن کی دعوت پر مدراس تشریف لے گئے اور وہاں اسلام پر چھ تقریریں کیں ۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے اور واپسی میں فرانس، اٹلی اور فلسطین کی سیر کرتے ہوئے ہندوستان آئے۔

۳۳ء میں تعلیمی اصلاحات پر مشورہ کرنے کے لئے شاہ افغانستان نے دعوت دی اور ڈاکٹر صاحب کابل تشریف لے گئے وہاں کے مختلف تاریخی مقامات کی زیارت کی اور ایک نظم (مسافر) میں اپنے تاثرات بیان کئے۔

ڈاکٹر صاحب کی آمدنی کا کوئی خاص ذریعہ نہ تھا۔ وکالت سے اُنھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کچھ عرصے سے ان کی تصنیفات سے کچھ آمدنی ہونے لگی تھی جس سے اُن کی اور خاندان کی بس گذر ہوتی تھی۔ کچھ عرصے سے نواب صاحب بھوپال نے چار سو روپئے وظیفہ مقرر کر دیا تھا اس سے انھیں کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔

اقبال آخر عمر میں بہت سی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے گلے

میں تکلیف تھی موتیا بند ہو گیا تھا اور دل کی شکایت تھی یہ ہی بیماریاں آخر اُن کے لئے مرض الموت بن گئیں اور ۱۹۳۸ء میں مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا مفکر سب سے بڑا شاعر اور سب سے بڑا فلسفی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا چرچا صحیح معنوں میں اس وقت سے شروع ہوا جب انھوں نے مخزن[1] میں نظمیں لکھنا شروع کیں۔ ان نظموں میں کچھ ایسی زندگی جوش اور ولولہ تھا کہ بہت جلد تمام ہندوستان میں مقبول ہو گئیں۔ اور ہر چہار طرف اقبال کا طوطی بولنے لگا۔ اس زمانے میں اقبال پر وطنیت (یعنی اپنے وطن سے محبت) غالب تھی۔ ہندی ترانہ (سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا) اور نیا شوالا اسی قسم کی نظمیں ہیں پھر یورپ جا کر اُن کے نقطہ نظر میں تبدیلی ہوئی اور عالم اسلام اور پھر دنیا کی عام مخلوق شاعر کی مرکزِ توجہ بن گئی۔

اقبال کی شاعری کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ بانگ درا۔ اسرار و رموز، پیام مشرق، جاوید نامہ، ضرب کلیم، مسافر، ارمغانِ حجاز وغیرہ۔ اقبال نے اپنے مجموعہ شاعری میں کیا کہا ہے اور شاعری سے ان کا مقصد کیا تھا۔ اس اہم سوال کا جواب دینا اتنا آسان نہیں ہے اور اس وقت شاید تم اُسے اچھی طرح سمجھ بھی نہ پاؤ۔ بس

---

[1] یہ ایک ماہوار رسالہ تھا جو شیخ (اب سر) عبدالقادر کی ایڈیٹری میں نکلتا ہے۔

مختصر طور پر یوں سمجھو کہ اقبال کا کلام نوجوانوں خصوصاً مسلمان نوجوانوں کے لئے زندگی کا پیغام ہے۔ آج کل کے مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہے۔ نہ اُن میں زندگی ہے، نہ امنگ نہ ولولہ۔ اقبال نے اس مرض کا سبب معلوم کرلیا ہے، وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں میں اب وہ پہلا سا اسلام نہیں ہے، اخلاق اسلامی میں نہ اعمال، نہ خدا پر اتنا پکا یقین ہے نہ رسول پر اور نہ دوسری اسلامی باتوں پر، اُن کی نمازوں میں وہ روح باقی نہیں ہے، وہ خدا سے زیادہ شیطان کے غلام ہیں۔ اقبال انھیں ابوبکرؓ و عمرؓ کے زمانے کی طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے مردہ جسموں میں پھر وہی حرارت پیدا ہو جائے اور اُن کی رگوں میں پھر وہی خالدی و حیدری خون دوڑنے لگے۔

اقبال نے یہ باتیں اُردو میں بھی کہیں فارسی میں بھی۔ فارسی میں اس لئے کہ عالم اسلامی کے زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے پیغام سے دلوں کو گرمائیں۔

اقبال مسلمان شاعروں میں مولانا رومی کے بعد پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعری سے یہ مفید کام لیا ہے۔ وہ یہ باتیں نثر میں بھی کہہ سکتے تھے لیکن وہ لوگوں پر اتنا اثر نہیں ڈال سکتی تھیں۔

اقبال کے سامنے اسلام اور اسلامی شریعت کے سلسلے میں کچھ اور اسکیمیں بھی تھیں، وہ موجودہ حالات کے مطابق اسلامی فقہ مرتب کرنا چاہتے تھے مگر افسوس! مسلسل بیماری اور پھر موت نے مہلت

نہ دی۔

اقبال کی طبیعت بہت سادہ اور فقیرانہ تھی اتنے بڑے آدمی تھے مگر ہر ایک سے بے تکلف ملتے تھے اُن کا دربار سب کے لئے عام تھا۔ ایک بڑی بات یہ تھی کہ ہر شخص سے اس کی قابلیت اور درجے کے مطابق بات چیت کرتے تھے اسی لئے بہت سے لوگوں کو اُن کے بارے میں یہ غلط اندازہ ہوتا تھا کہ اقبال کو ہم نے جیسا سنا تھا ویسا نہ پایا، حالانکہ پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگوں میں ان کی گفتگو نہایت عالمانہ اور حکیمانہ ہوتی تھی۔

انھیں اسلام اور قرآن سے بے انتہا شغف تھا آخری عمر میں قرآن پڑھتے وقت روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں، نماز بھی بہت خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے، اسلامی شریعت کے احترام کا یہ حال تھا کہ ایک بار اُنھیں حکومت ہند جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنانا چاہتی تھی مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں اور سرکاری تقریبوں میں ان کی بیوی بھی شریک ہوں اقبال نے یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور وائسرائے سے کہا کہ میں بے شک ایک گنہگار آدمی ہوں۔ احکام اسلام کی پابندی میں مجھ سے بہت سی کوتاہیاں ہوتی ہیں مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لئے شریعت کے حکم توڑ دوں۔

ایک دفعہ ایک رئیس کے یہاں ٹھیرے تھے وہاں سونے کے

کمرے میں ہر طرف قیمتی سامان اور نہایت نرم اور قیمتی بستر دیکھ کر اُن کے دل میں خیال آیا کہ جس رسولِ پاک کی جوتیوں کے صدقے میں ہمیں آج یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں اُس نے بوریئے پر سو کر زندگی گذاری۔ بس یہ خیال آتے ہی آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ بستر پر لیٹنا اُن کے لئے ناممکن ہو گیا۔ برابر کے غسل خانے میں کرسی بچھا کر بیٹھ گئے اور دیر تک روتے رہے کچھ سکون ہوا تو ملازم سے اپنا بستر منگوایا اور اسی غسل خانے میں چارپائی بچھا کر سوئے۔

غرض ڈاکٹر اقبال ایک سچے مسلمان تھے اسلام اور قرآن کی تعلیم پر اُن کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ بہت بڑے عالم تھے۔ فلسفی تھے اور شاعر تھے۔ اُن کے علم پر اُن کی شاعری پر بے شمار مضمون لکھے گئے ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تصانیف کے دوسری زبانوں میں ترجمے کئے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور برابر جاری رہے گا۔ اقبال سچ مچ اس کے مستحق بھی تھے۔ ایسی شخصیت صدیوں کے بعد ہم میں پیدا ہوئی تھی اور معلوم نہیں اب کب پیدا ہو۔

مصطفیٰ کمال پاشا

(اتاترک)

مصطفیٰ کمال پاشا ۱۸۸۰ یا ۱۸۸۱ء میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے ان کا باپ معمولی تنخواہ پر ایک دفتر میں ملازم تھا۔ پھر تجارت شروع کردی تھی مصطفیٰ کمال پہلے قرآن حفظ کرنے کے لئے ایک مدرسے میں بٹھائے گئے، اسی زمانے میں ان کے باپ کا انتقال ہوگیا اور ان کی ماں اپنے بال بچوں کو لے کر میکے چلی آئی۔ وہاں انھیں اصطبل کی صفائی، جانوروں کو چرانے اور کھیت سے پرندوں کو اڑانے کا کام سپرد ہوا۔ یہ کام مصطفیٰ کمال کو بہت پسند آیا ان کی تندرستی بھی اچھی ہو گئی پھر خالہ نے انھیں ایک مدرسے میں داخل کردیا مگر مدرسے میں ان کا جی نہ لگا اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ آخر ماں کی مرضی کے خلاف سالونیکا کے فوجی مدرسے میں داخل ہوگئے۔ یہاں اُن کی قابلیت کے جوہر کھلے اور بہت جلد وہ سب لڑکوں میں ممتاز ہوگئے سترہ سال کی عمر میں اس مدرسے کی تعلیم سے فارغ ہوکر وہ موناسٹر

کے بڑے جنگی مدرسے میں داخل ہوئے۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو قسطنطنیہ کے فوجی کالج میں داخل ہوے۔ ۱۹۰۵ء میں یہاں کی تعلیم ختم کرکے افسروں کے کالج میں شامل ہوے کہ فوج میں افسروں کا عہدہ حاصل کرسکیں۔ یہ سلطان عبدالحمید کی حکومت کا زمانہ تھا۔ یہ سلطان اپنی سفاکی، ظلم اور فرعونیت کے لئے مشہور ہے۔ تمام ترک اس کی حکومت سے بددل اور بیزار تھے خود فوجی کالج کے لڑکوں میں بغاوت کے جذبات پیدا ہورہے تھے۔ مصطفیٰ کمال انقلاب فرانس پر لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔ وہ موجودہ سلطان کے بہت خلاف تھے اس لئے لڑکوں کی اس تحریک میں وہ پیش پیش تھے اس تحریک کو وہ کالج سے باہر رہ کر بھی چلاتے رہے۔ سلطان نے انھیں اور دوسرے فوجی افسروں کو مختلف جگہ بھیج دیا۔ مگر اس سے یہ تحریک اور بھی زور پکڑنے لگی آخر سلطان عبدالحمید انجمن اتحاد و ترقی کی کوششوں سے معزول کردئے گئے۔ اور حکومت انقلاب پسند جماعت اس زمانے کی انجمن اتحاد و ترقی کے ہاتھ میں آگئی۔ مصطفیٰ کمال اس تبدیلی سے بھی مطمئن نہ ہوئے۔ سلطنت کے اچھے اچھے علاقے ہاتھ سے نکل رہے تھے اور ملک میں عام طور پر سیاسی بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک اور بات انھیں کھٹکتی تھی کہ ملک کی سیاست میں جرمنوں کا اثر بڑھتا جارہا تھا۔ وہ اس کے بھی سخت خلاف تھے کہ جنگ عظیم میں ٹرکی جرمنی کا ساتھ دے۔ انھیں یقین تھا کہ

جرمنی کو شکست ہوگی اور یہی ہوا. تاہم اس زمانے میں انھیں جہاں اور جس کام کے لئے بھیجا گیا انھوں نے اپنے فرائض بہت خوش اسلوبی سے انجام دیئے. خصوصًا گیلی پولی کا معرکہ جس میں انگریزی فوج نے اپنی جان لڑا دی تھی ان ہی کی بدولت سر ہوا اور انگریزی فوجوں نے بُری طرح شکست کھائی. لڑائی ختم ہوئی تو جرمنی کے ساتھ ترکی بھی شکست خوردہ فوجوں میں تھا. اور اتحادی یعنی انگریزی. فرانسیسی اور اطالوی فوجیں ملک میں گھسی چلی آرہی تھیں خود دارالخلافہ[۱] میں چاروں طرف انگریز ہی انگریز نظر آتے تھے ادھر سمرنا اور تھریس پر یونانیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور ترکوں پر انتہائی وحشیانہ مظالم کر رہے تھے. غرض ترکی حکومت لیڈروں اور قوم کی حالت کچھ عجیب بے بسی کی تھی. ہر طرف مایوسی اور ناامیدی چھائی ہوئی تھی. خلیفہ کی حالت بالکل قیدی کی سی تھی. نمک حراموں اور غداروں کی بن آئی تھی اور من مانی کارروائی کر رہے تھے. اس پُرآشوب زمانے میں صرف ایک شخصیت تھی جو اپنے ملک کی اس حالت سے بہت بے چین تھی مگر ناامید نہیں تھی. یہ شخصیت مصطفےٰ کمال کی تھی. وہ اپنی قوم کی طبیعت سے خوب واقف تھے انھیں یقین تھا کہ اگر ہمت واستقلال سے کام لیا جائے تو ترک قوم میں زندگی پیدا ہو سکتی ہے اور وہ ایسی طاقت بن سکتے ہیں کہ مخالف قوتوں سے ٹکرا کر انھیں پاش پاش کر دیں. اُنھوں نے غور و فکر میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ کام میں لگ گئے. اور قوم کو اُبھارنے اور اس میں

[۱] استانبول یا قسطنطنیہ

جوش وخروش پیدا کرنے کے لئے انھوں نے وہ سب کچھ کیا جوان کے امکان میں تھا۔ انھوں نے اپنی تقریروں، تحریروں اور مختلف تدبیروں سے پوری قوم کو ایک مرکز پر متحد کر دیا۔ اُن کا مقصد بس ایک تھا دشمنوں کو ملک سے نکالنا اور اپنے ملک کی بدنظمی کو دور کرنا۔ انھیں شروع سے آخر تک بڑی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا حکومت نے باغی قرار دیا۔ ان کے قتل پر انعام مقرر کیا۔ اور ان کے خلاف فوجیں بھیجیں مگر یہ فولادی انسان برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ وہ ملک کے غداروں سے لڑا سمرنا اور تھریس سے یونانیوں کو مار کر بھگایا اتحادی فوجوں کو ملک سے نکلوایا اور اپنی طاقت کے بل پر اتحادیوں سے ایسی شرطوں پر صلح کی جس سے ملک کی آبرو کو چار چاند لگ گئے۔ اس نے انگورہ میں ترکی پارلیمنٹ کے مقابلے میں مجلس وطنی کے نام سے ایک انجمن بنائی اور یہی انجمن اب قومی پارلیمنٹ ہے اور ملک پر حکومت کر رہی ہے۔

اس انقلاب کے زمانے میں انھوں نے اپنے مقصد کو ہمیشہ سامنے رکھا اور دوست دشمن جو کوئی بھی سامنے آیا اُسے راستے سے ہٹا دیا اگر وہ اپنے نادان دوستوں کی مروت کرتے یا دشمنوں سے مرعوب ہو جاتے تو انھیں کبھی اتنی کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ اپنے مقصد کی خاطر ہر قسم کی قربانی جائز ہے۔

مصطفیٰ کمال جب اپنے اس انقلابی کارنامے سے فارغ ہوئے تو انھیں آرام کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ مگر اُنھوں نے اس مشورے کو قبول

نہیں کیا۔ اُن کے خیال میں کام کرنے کا وقت اب آیا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے خلافت کا خاتمہ کیا کہ یہ اب ترکوں کے لئے ناقابل برداشت مصیبت بن گئی تھی۔ پرانی خانقاہوں کو توڑا جو ہر قسم کی خرافات کا مرکز تھیں اور قوم کے جسم میں بداخلاقی کا زہر پھیلا رہی تھیں۔ متعصب ملاؤں کے اقتدار کو ختم کیا جن میں اسلامی روح بالکل فنا ہو چکی تھی۔ عربی رسم الخط کو وہ ملک کے لئے مضر سمجھتے تھے اس کی جگہ انھوں نے رومن رسم الخط جاری کیا۔ قبہ اور طربوش کی جگہ لوگوں کو ہیٹ پہنایا۔ سائنس۔ تجارت انجینری۔ غرض ہر چیز کی ترقی میں انھوں خود دلچسپی لی۔ اور ترقی کے ہر میدان میں قوم کو اس تیزی سے آگے بڑھایا کہ تھوڑے دنوں میں ترک قوم ایک نئے سانچے میں ڈھل گئی اور ترکی حکومت یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کے قدم بقدم چلنے لگی۔ قوم نے اُسے اتاترک (ترکوں کا باپ) کا خطاب دیا وہ واقعی اتاترک تھا۔

ٹرکی کی تعمیر و اصلاح کا کام بہت تیزی سے جاری ہے مگر مسلسل کام کی وجہ سے مصطفیٰ کمال کی صحت خراب ہو چکی تھی لیکن کام کے مقابلہ میں اُنھوں نے صحت کی کبھی پروانہ کی۔ اسی لئے ان امراض نے آخر میں خطرناک صورت اختیار کی اور ۳۸ءہ میں دنیا کا یہ بہت بڑا مدبر اس دنیا سے رخصت ہوا۔ ترک قوم نے اپنے اس محسن کے مرنے کا سوگ بھی ایسا منایا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ وہ اپنے آپ کو مٹا کر ساری قوم کو زندہ کر گیا۔

(رحمتی رقم سہارنپوری)

فہرست ناموران اسلام باعتبار فن

فن	نام	صفحہ
۱۔ مفسر	۱۔ طبری	۷۰
	۲۔ زمخشری	۴۶
	۳۔ امام رازی	۱۵۸
۲۔ محدث	۱۔ امام مالک	۴۰
	۲۔ " احمد بن حنبل	۵۵
	۳۔ " بخاری	۶۱
۳۔ فقیہ	۱۔ امام ابوحنیفہ	۳۴
	۲۔ امام شافعی	۵۰
	۳۔ ابوداؤد الظاہری	۶۷
۴۔ علماء	۱۔ امام ابوالحسن اشعری	۹۳
	۲۔ علامہ ابن حزم	۱۲۴
	۳۔ شاہ ولی اللہ	۲۲۳
۵۔ مصلحین	۱۔ امام ابن تیمیہ	۱۸۰
	۲۔ حضرت مجدد الف ثانی	۲۱۷
	۳۔ سید جمال الدین افغانی	۲۴۷
	۴۔ سرسید احمد خاں	۲۳۳
۶۔ صوفیا	۱۔ امام غزالی	۱۳۶
	۲۔ شیخ عبدالقادر جیلانی	۱۶۱
	۳۔ " ابن عربی	۱۶۵
	۴۔ " خواجہ معین الدین	۱۵۳
۷۔ خلفا	۱۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز	۲۳
	۲۔ عبدالرحمٰن الداخل	۴۶
	۳۔ خلیفہ مامون عباسی	۸۳
	۴۔ سلیمان اعظم	۱۹۸
۸۔ سلاطین	۱۔ ملک شاہ سلجوقی	۱۳۱
	۲۔ سلطان صلاح الدین	۱۴۹
	۳۔ شیر شاہ سوری	۲۱۱
۹۔ وزرا	۱۔ جعفر برمکی	۴۳
	۲۔ نظام الملک طوسی	۱۲۷
	۳۔ ابوالفضل	۲۱۴
۱۰۔ سپہ سالار	۱۔ سعد بن ابی وقاص	۹
	۲۔ خالد بن ولید	۱۴
	۳۔ محمد بن قاسم	۱۸
	۴۔ طارق بن زیاد	۲۹

۱۱۔ جہازران	۱۔ خیر الدین پاشا	۲۰۵
۱۲۔ مورخین	۱۔ ابن اثیر	۱۶۳
	۲۔ ابن خلکان	۱۷۸
	۳۔ شمس الدین ذہبی	۱۸۶
	۴۔ ابن خلدون	۱۹۴
	۵۔ مولانا شبلی	۲۵۸
۱۳۔ فلسفی	۱۔ ابونصر فارابی	۹۰
	۲۔ ابوریحان بیرونی	۷۰
	۳۔ ابن رشد	۱۴۴
۱۴۔ طبیب	۱۔ ابوبکر زکریا رازی	۱۱۲
	۲۔ ابن سینا	۱۱۷
	۳۔ حکیم اجمل خاں	۱۶۲
۱۵۔ سائنس دان	۔ ابن ہیثم	۱۰۳

۱۶۔ سیاح	۱۔ ابن جبیر	[illegible]
	۲۔ ابن بطوطہ	
۱۷۔ شعراء	۱۔ متنبی	
	۲۔ مولانا رومی	
	۳۔ خواجہ حافظ	
	۴۔ غالب	
	۵۔ اقبال	
۱۸۔ ادیب	۱۔ جاحظ	
	۲۔ شیخ سعدی	
	۳۔ آزاد	
	۴۔ حالی	
۱۹۔ مدبرین	۱۔ مولانا محمد علی	
	۲۔ مصطفیٰ کمال	